ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۲۰

دوسرا سال: آٹھویں کتاب

اگست ۲۰۰۴ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey@poetic.com

فون: ۰۶۱-۵۲۳۴۸۶ ، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان

قیمت: تیس روپے

زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ چند بزرگوں کے خطوط — ڈاکٹر سید معین الرحمٰن — ۵

۳۔ مرزا غالب اور اردو کی ادبی روایت — ڈاکٹر فاروق عثمان — ۱۱

۴۔ دورِ حاضر کی پاکستانی شاعری میں عصری مسائل کا ادراک — ڈاکٹر مظفر عباس — ۱۶

۵۔ ''سندھ کی ثقافتی اور تہذیبی..... — غلام حسین ساجد — ۲۰

۶۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات ۱۰) — ابن حسن — ۲۵

کہانی:

۷۔ غبارہ موومنٹ — احمد ندیم تونسوی — ۳۵

۸۔ روشنی — لیاقت علی — ۵۱

سلسلہ وار ناول:

۹۔ ایک مرد (قسط ۱۲) — اور یا نا فلاشی / خالد سعید — ۵۶

غزلیات:

۱۰۔ آٹھ غزلیں (ارشد ملتانی)، دو غزلیں (نجم الاصغر شاہیا)، دو غزلیں (قاضی حبیب الرحمٰن) دو غزلیں (احمد صغیر صدیقی)، چار غزلیں (ڈاکٹر خیال امروہوی)، دو غزلیں (خاور اعجاز) چھ غزلیں (قیوم طاہر)، دو غزلیں (پرویز ساحر)، چار غزلیں (محمد فیروز شاہ)، دو غزلیں (نوازش علی ندیم)، ایک غزل (منور عزیز)، ایک غزل (قاضی عطاالرحمٰن)، دو غزلیں (عطاالرحمٰن تمثیل) — ۶۵-۸۸

نظمیں:

۱۱۔ قبرستان میں اُگنے والی نرگس بولی (نجم الاصغر شاہیا) سحر لازوال (ڈاکٹر خیال امروہوی)، ویلنٹائن ڈے (راج کنور) — ۸۹-۹۱

حروفِ زر (قارئین کے خطوط):

۲۰۔ بنام مرتب — ۹۲

سید عامر سہیل

چند باتیں

فن کی کسوٹی پر کون پورا اترتا اور لفظوں کی حرمت کو کون قائم رکھتا ہے، اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرتا ہے تاہم اپنے گرد و پیش لفظوں کے جنگل میں چھائے ہوئے سناٹے کو محسوس کر کے یہی اندازہ لگایا جس سکتا ہے کہ لفظ کی اثر پذیری اور صورتِ واقعہ کو تبدیل کر دینے کی صلاحیت کو ہماری ریاکارانہ مصلحت پسندی اور مفاد پرستی نے سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ایک وقت تھا کہ دھیمی سی سرگوشی بھی سماعتوں میں اتر جاتی اور ماحول میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھی، لفظ محض لغت میں شامل بے جان جسم نہیں بلکہ یہ ایک معاشرے کے اجتماعی ضمیر کی علامت تھا۔ مگر اب بلند اور مسلسل آوازیں کسی قسم کا ارتعاش پیدا کرنے سے عاری ہیں؟ بے حسّی اور بے برکتی کا یہ موسم کیسا بدرنگ اور بد ذائقہ ہے۔ اب تو چیختے معنوں والی سطریں بھی اپنی آواز کھو بیٹھی ہیں۔ ایک دور تھا کہ کتاب کی اشاعت ایک واقعہ بن جایا کرتی تھی، ایک ایسا واقعہ جو پڑھنے اور سمجھنے والوں کو بے چین کر دیتا تھا۔ ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ کی گونج مدتوں سنائی دیتی تھی اور ذہن و دل کی قلبِ ماہیت کرتی تھی۔ اور اب یہ عالم ہے کہ ہر روز بیسیوں کتابیں شائع ہو رہی ہیں، شعری اور نثری مجموعے ایک تسلسل کے ساتھ مارکیٹ میں آ رہے ہیں۔ دلکش سرورق، دلفریب طباعت کے ساتھ خود کو ''جدید تقاضوں'' سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اب کتاب کے ہمراہ کمپیوٹرسی ڈی، وش کارڈز اور دیگر لوازمات دیئے جاتے ہیں۔ یہ سبھی کچھ اب تواتر سے ہونے لگا ہے، اب اس دوڑ میں نئے اور پرانے شاعر اور ادیب شامل ہونے لگے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ لکھنے والوں کو خود اپنے لکھے لفظوں کی صداقت اور اثر پذیری کا یقین نہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے لکھے لفظ جذبوں سے عاری اور خود سے شرمسار ہیں اسی لئے وہ دیگر سستے کاروباری حربے استعمال کرتا ہے۔ اب کتاب ایک آدرش، ایک پیغام، ایک کرن اور امید باندھنے کا ذریعہ نہیں بلکہ ان لوگوں کے سبب ایک کاروبار کا ذریعہ بن چکی ہے۔ اب اس صورتِ حال میں ایک پڑھنے والا کیا پڑھے اور کس طرح لفظ پر اعتبار کرے؟ لکھنے والا تو تجارتی بنیادوں پر چل رہا ہے مگر ایک قاری کا کیا قصور ہے؟؟؟ اسے لفظ پر اعتبار کرنے کی اتنی بڑی سزا کیوں دی جا رہی ہے؟؟؟

اس سارے کے باوجود نجانے کیوں یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام تر بے معنویت اور بداعتمادی کے باوجود لفظ ہی تبدیلی کا آخری ذریعہ ثابت ہوں گے!!! مگر وہ لفظ کون لکھے گا؟؟ اور اسے کس طرح شناخت کیا جا سکے گا؟؟؟ یقیناً یہ بھاری ذمہ داری بھی قاری ہی کو اٹھانا پڑے گی اور اسے اس خارزار سے خود ہی راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تلاش کے اس عمل میں قاری کی مدد کس طرح کی جا

سکتی ہے---؟؟؟ چاروں طرف سے ہونے والے یلغار میں ڈھال کون بنے گا---؟؟؟ اس کام میں ہم بطور ادیب اور بطور قاری اپنا حصہ کیسے ڈال سکتے ہیں-----؟؟؟ یقیناً اس کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہے وہ ''کاروباری'' ادیبوں کے پاس ہیں ہاں البتہ لفظ کو زندہ کرنے کے لئے جس تخلیقیت اور جذبے کی قوت درکار ہے وہ اُن کاروباری لوگوں کے پاس موجود نہیں۔ اب اس کے لئے ضروری ہے کہ لکھا جائے اور مسلسل لکھا جائے ذات اور ماحول کے مکمل تجزیے اور تجربے کے بعد!!! اور یہ طے ہے کہ آخری لڑائی لفظ ہی نے لڑنی اور جیتنی ہے۔

اور آخر میں چند جملے ملتان میں مقیم نامور محقق، دانشور اور قدیم آثار کے ماہر مرزا ابن حنیف کے لئے جو ۲۹ر جولائی ۲۰۰۴ء کو بہ قضائے الٰہی انتقال فرما گئے ہیں۔ یقیناً یہ خبر اردو دنیا میں بڑے رنج سے سنی جائے گی۔ قدیم ادب، اساطیر، مصریات، تاریخ اور قدیم تہذیبوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جو لوگ ان کی شخصیت اور کام سے آگاہ ہیں وہ ان کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی پوری زندگی علم و ادب کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اپنے تحقیقی میدان میں جتنا کام ابن حنیف صاحب نے سرانجام دیا ہے وہ کام شاید ہمارے اداروں کے بس میں بھی نہیں۔ تخلیق کائنات، سات دریاؤں کی سرزمین، ہزاروں سال پہلے، دنیا کا قدیم ترین ادب (دو جلدیں)، مصر کا قدیم ادب (چار جلدیں) بھولی بسری کہانیاں (اس عنوان کے تحت مصر، بھارت اور یونان کے حوالے سے ضخیم کتب موجود ہیں)، جنوبی پنجاب کے آثارِ قدیمہ وغیرہ ان کی مطبوعہ کتب ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے غیر مدوّن مضامین کی تعداد سینکڑوں میں ہے، نیز اس کے علاوہ 'مار پرستی' اور ملتان کے آثار کے حوالے سے مسودات زیرِ تکمیل تھے۔ یقیناً اپنے میدان میں کام کرنے والوں میں ابن حنیف صاحب واحد بڑا حوالہ تھے۔ شخصی اعتبار سے انہوں نے زندگی نہایت خودداری، پیہم ریاضت مگر گوشہ نشینی میں گزاری۔ فن کے ساتھ ساتھ وہ اپنے شخصی رویوں میں بھی بلاشبہ بہت بڑے انسان تھے۔ علم دوستی اور انسان دوستی ان کی زندگی کا منشور تھے۔ ملتان کی علمی فضا خصوصاً اور اردو دنیا عموماً ان کے انتقال سے ایک بڑے انسان اور ادیب سے محروم ہوگئی ہے۔

☆☆☆

ترتیب وتعارف: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

چند بزرگوں کے خطوط

مسلسل بائیس برس شعبۂ اُردو جی سی یونیورسٹی، لاہور سے پروفیسر اور چیئرمین کے طور پر وابستہ رہنے کے بعد میں نومبر ۲۰۰۲ء کے شروع میں وظیفہ یاب ہوا___ تدریسی اور تحقیقی اُمور میں رہنمائی کی ذمہ داری سے رسمی فرصت اور فراغت پائی تو میں نے اپنے شخصی ذخیرۂ کتب اور مکاتیب کو مرتّب کرنے میں کچھ وقت صرف کیا___ مکاتیب کا میرا کلکشن خاصا مضبوط ہے___ غالب سے لے کر آج تک کے بیشتر اہلِ علم وقلم کی قلمی تحریریں میرے ذخیرۂ نوادر کا حصہ ہیں۔

خط، اگر وہ بالقصد نہیں لکھے گئے تو، لکھنے والے کے سچے اور کھرے محسوساتِ دلی اور وارداتِ قلبی کا مظہر اور بدل ہوتے ہیں___ بے تکلف خطوط ایک نعمت اور دولت ہیں___ ان کی روشنی میں مکتوب نگار کے فکری اور جذباتی اُتار چڑھاؤ کی ترسیم، آسان اور کار برآر جانی اور مانی گئی ہے___ اس لیے کسی شخص کے مزاجی رویوں کی گہرائی اور گیرائی کو پانے کے لیے نیُاس کے خطوں کا مطالعہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس پر زیادہ زور دینا یا تادیر گفتگو کرنا امرِ زائد ہوگا___ میں اس سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔

آج کی نشست میں کچھ بزرگوں کے خط محفوظ کرتا ہوں___ پیش کردہ خطوں کی ضروری تفصیل اور ترتیب یہ ہے:

۱۔ خط مولانا رازق الخیری (۱)، بنام: سید وقار عظیم (۲)، مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۶۷ء۔
۲۔ خط جناب صادق الخیری (۳)، بنام: سید وقار عظیم، مورخہ ۶ جون ۱۹۶۹ء۔
۳۔ خط پیر سید حسام الدین راشدی (۴)، بنام: سید معین الرحمٰن، یکم جنوری ۱۹۶۹ء۔
۴۔ خط پیر سید حسام الدین راشدی، بنام: سید وقار عظیم، ۱۶ جون ۱۹۷۴ء۔
۵۔ خط جناب اسداللہ شاہ (۵)، بنام: سید معین الرحمٰن (۶)، ۸ فروری ۱۹۶۹ء۔
۶۔ خط پیر سید حسام الدین راشدی، بنام: سید معین الرحمٰن، ۱۵ اپریل ۱۹۶۹ء۔
۷۔ خط پیر سید حسام الدین راشدی، بنام: سید معین الرحمٰن، ۲۴ جنوری ۱۹۷۰ء۔
۸۔ خط پیر سید حسام الدین راشدی، بنام: سید معین الرحمٰن، ۱۵ اگست ۱۹۷۱ء۔
۹۔ خط پیر سید حسام الدین راشدی، بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۹ دسمبر ۱۹۷۵ء۔

مجموعی طور پر چار بزرگوں کے یہ نو خط ایک تہائی صدی سے زیادہ پرانے ہیں۔ اس لیے کچھ توضیحات اور حوالوں کی ضرورت تھی۔ حواشی میں اختصار برتا گیا ہے۔ مقصود اصلی ان قیمتی رقعات کا محفوظ ہو جانا ہے۔ اکابر کے ''اصل'' میرے شخصی ذخیرۂ نوادر کی زینت ہیں۔ اس تمہید کے بعد خطوں کا متن ملاحظہ ہو:

[۱]

خط مولانا رازق الخیری، بنام: پروفیسر سید وقار عظیم

دفتر عصمت وبنات وجوہرِ نسواں، کراچی-۴ مورخہ: ۱۴ مارچ ۱۹۶۷ء

برادرم، سلام مسنون! جنوری میں کراچی میں گلڈ کی میٹنگ ہوئی تھی اور آپ آنے والے تھے معلوم ہوا طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوگئی، اس لیے نہ آسکے___ یہ پوسٹ کارڈ مضمون کے لیے نہیں لکھ رہا۔ ''عصمت'' آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ کبھی تو آپ کا جی چاہے گا ہی کہ ''عصمت'' میں آپ کا مضمون شائع ہو۔

یہ پوسٹ کارڈ اوّل تو اس غرض سے بھیج رہا ہوں کہ آپ اپنی خیریت سے مطّلع فرمائیے___ دوسرے یہ کہ پرچہ آپ کو ماہ بہ ماہ مل جاتا ہے یا نہیں؟ دولت خانے کا پتہ مجھے نہیں معلوم، ورنہ وہاں بھیج دیا کروں۔

نیازمند: رازق الخیری

[۲]

خط، جناب صادق الخیری، بنام: پروفیسر وقار عظیم

خیاباں، بلاک ۴، ناظم آباد، کراچی-۱۸ ۶ جون ۱۹۶۹ء

اومیاں! سلامت رہو (یہ کیسا عنوان ہے، ایک ذرا ''برادرم، سلام مسنون'' سے ہٹ کر؟)

اچھا سُنو، مجھے اپنے افسانوں کے ایک مجموعے ''سفینے'' کی ضرورت ہے۔ تھیٹر کی زبان میں [سخت] کو خوب کھینچ کر پڑھو، بس اتنی زبردست ضرورت ہے! ''سفینے'' کو چھپے ایک زمانہ ہوگیا، کہیں نہیں ملتی۔ شاید کسی پرانے کتب فروش کے ہاں جو ۱۹۴۷ء سے پہلے (سے) یہ کام کرتا ہے، کوئی جلد موجود ہو، مگر اس پر تکیہ نہ کرنا___ تم کتابوں کے کھوجی ہو، کہیں سے بھی پتہ چلاؤ اور مجھے بھیج دو اور چاہے جو انعام لے لو!

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمہارے اپنے کتب خانے میں موجود ہو مگر چونکہ وہ بھی انقلاب میں سے گزرا ہے، اس لیے قطعی طور پر نہیں معلوم___ بہرحال ڈھونڈو، مانگو، خریدو، حد یہ ہے کہ چراؤ، اگر کہیں بھی نہ ملے تو لائبریریوں کو ٹٹولو___ کسی نہ کسی علمی یا قدیمی یا بڑی لائبریری میں ضرور ہوگی___ بہرحال یہ بھی ''ریسرچ'' کا کام ہے، شاید اس طرح تم ثواب کے مستحق ہو جاؤ۔

مجھے تمہارا صحیح پتہ نہیں معلوم___ خدا کرے یہ خط تمہیں مل جائے___ مگر یہ کیا کہ ایک عمر ہونے کو آئی مگر اخباروں سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تم وائس چانسلر بن گئے یا بننے والے ہو۔ دیکھو، یہ ضرور کر گزرنا___ ریٹائر ہونے سے پہلے تم نے یہ نہیں کیا تو اُردو افسانہ تمہیں کیا کہے گا؟ ایک بڑا اچھا سا، پیارا سا خط لکھو۔

مخلص: صادق الخیری

[۳]

خط، پیر سید حسام الدین راشدی بنام: سید معین الرحمٰن

یکم جنوری ۱۹۶۹ء

عزیزی (سید معین الرحمٰن صاحب): آپ کا گرامی نامہ بڑی دیر سے جواب طلب ہے۔ مصروفیت نے موقع نہیں دیا۔ میں غالب کے سلسلے میں چھ(۶) شخصیتوں پر لکھ رہا ہوں۔ یہ مجموعہ ''دودِ چراغِ محفل'' کے نام سے چھپے گا۔

سندھی میں جو مقالات یا تراجم چھپے ہیں آپ براہِ کرم: سندھی ادبی بورڈ، امین منزل گاڑی احاطہ، حیدرآباد، سندھ کے ذریعے ان کی فہرست طلب کریں۔ میرا حوالہ ان کو دے دیں۔ اگر کچھ ہوا تو لکھ دیں گے۔ خدا آپ کو توفیق دے، کام اہم ہے اور ضروری ہے۔

والسّلام: حسام الدین راشدی

[۴]

خط، پیر سید حسام الدین راشدی، بنام پروفیسر سید وقار عظیم

۱۸جون۱۹۷۴ء

محترم سید صاحب: کل ''مجلس'' (۷) کی جانب سے خط ملا۔ دس روپے کا چیک آپ کے پتے پر ارسالِ خدمت ہے۔ مجھے ممبر بنوا دیجیے گا۔ اگر کوئی یادگار کتاب مرتّب کی جائے تو میں مقالہ لکھوں گا___ اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

کتنا الم ناک حادثہ ہے کہ ایک مخلص دوست یک لخت درمیان میں سے اُٹھ گیا (۸)۔

والسّلام، خیر اندیش: حسام الدین راشدی

[۵]

خط، جناب اسد اللہ شاہ، بنام: سید معین الرحمٰن

سیکریٹری سندھی ادبی بورڈ آفس — Miscl1-(69)-84

امین منزل، گاڑی کھاتہ، حیدرآباد — تاریخ: ۸فروری۱۹۶۹ء

مکرمی (جناب سید معین الرحمٰن)، تسلیم:

آپ کا مراسلہ مورخہ ۲۷جنوری ۱۹۶۹ء ارسال (موصول) ہوا۔ شکریہ۔ آپ کے استفسار کے جواب میں عرض ہے کہ سندھی زبان میں مرزا غالب پر آج تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ البتہ چند ایک مختصر مضامین ماہنامہ ''نئیں زندگی'' کراچی میں شائع ہوئے تھے(۹) آپ اس سلسلے میں ایڈیٹر ماہنامہ ''نئیں زندگی'' پاکستان پبلی کیشن، پوسٹ باکس ۱۸۳، کراچی سے براہِ راست خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ والسّلام:

اسد اللہ شاہ
سیکریٹری، سندھی ادبی بورڈ

[۶]

خط، پیر سید حسام الدین راشدی، بنام: سید معین الرحمٰن

حسام الدین راشدی — ۵/۳۶، عامل کالونی:۲

۱۵اپریل[۱۹۶۹ء] — کراچی: ۵

بھائی، خط پہنچا، کتابیں بھی وصول ہوئیں (۱۰)۔ آپ لوگ نوجوان اور خدا کے فضل سے باذوق اور اور صاحب قلم بھی ہیں۔ خوب لکھیے۔ اُردو کا دامن اچھی کتابوں سے بھر جایئے۔ انشاء اللہ پہلی فرصت میں دونوں کتابیں پڑھ کر پھر کچھ لکھ سکوں گا۔ بہر حال، فی الحال مبارک قبول فرمائیں اور عزیزی اختر وقار (۱۱) تک بھی مبارک پہنچا دیجیے۔

میری کتاب ''دُودِ چراغِ محفل'' (۱۲) ابھی چھپی نہیں۔ اگلے ماہ کے دس تک اُمید ہے کہ تمام کتابیں نکل آئیں، فوراً ارسال کروں گا۔ ''اشاریہ'' (۱۳) جب چھپے تو فوراً ارسال فرمایئے گا۔ اُمید ہے کہ خیریت ہوگی۔

نیاز آگیں: حسام الدین

[۷]

خط، پیر سید حسام الدین راشدی، بنام: سید معین الرحمٰن

کراچی، ۲۴جنوری[۱۹۷۰ء] — [مرکزی اُردو بورڈ (شاخ حیدرآباد)، منظور چیمبرز، حیدرآباد]

عزیزی سید معین الرحمٰن

''اِشاریۂ غالب'' ملا۔ آپ کی محنت، نظر وسیع اور مطالعے کی وسعت کی داد دینی پڑتی ہے۔ واقعی ایک نئے انداز سے آپ نے انڈکس بنایا ہے۔ خدا آپ کو توفیق دے۔ آپ جیسا نوجوان اُردو ادب اور اُردو علم کے لیے ایک تابندہ ستارہ ہے۔ آپ جیسے نوجوان کی محنتیں اور محبتیں، اُردو کے لیے سرمایۂ حیات ہیں۔ باقی جو کچھ ہو رہا ہے وہ خانہ پُری سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا___ خدا کرے دوسری جلد بھی جلد آجائے۔

میں نے مرزا ظفر الحسن (۱۴) سے عرض کر دیا ہے کہ ایک سیٹ آپ کی خدمت میں روانہ کر دیں۔ اُمید ہے کہ ملا ہوگا___ ورنہ ایک کارڈ یاددہانی کا لکھ دیں۔

اپنے علمی مشاغل سے ہمیشہ واقف فرماتے رہیں۔

والسلام، نیاز آگیں:
حسام الدین راشدی

[۸]

خط، پیر سید حسام الدین راشدی، بنام: سید معین الرحمٰن

۱۵ اگست [۱۹۷۱ء]

برادرِ عزیز!

کتاب (۱۵)، مکتوب اور تبصرہ ایک ہی (پیکٹ) میں ملے، بے حد شکر گزار اور ممنونِ احسان ہوں۔ آپ کی محبت اور علمی شغف ہے۔ بہت محبت آمیز تبصرہ (۱۶) فرمایا ہے۔ خدا خوش رکھے۔

سرسری کتاب پر نظر ڈالی ہے لیکن دو کتابیں اور ختم کرنی ہیں۔ انشاء اللہ اس کے بعد اس کو پڑھ کر بہ تفصیل اپنی رائے خدمت میں بھیجوں گا ___ بہر حال، آپ کی محنت، کاوش، تلاش اور ذوق کا میں ہمیشہ سے معترف ہوں ___ خدا یہ سب اوصاف باقی رکھے۔ آپ مستقبل کے اعلیٰ محقق ہیں۔

نیاز آگیں: حسام الدین

[۹]

خط، پیر سید حسام الدین راشدی، بنام: سید معین الرحمٰن

۶۰-الحمرا سوسائٹی، کراچی-۰۸۱۶ ۹ دسمبر ۱۹۷۵ء

عزیزی ڈاکٹر (معین الرحمٰن) صاحب: مولانا عبدالحق پر آپ کی لکھی ہوئی کتاب ''ذکر عبدالحق'' ملی۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ یادوں پر دکھی ہوا، آپ کے کام پر خوش ہوا! خدا آپ کو توفیق دے اور اس طرح کا علمی کام کرتے رہیں۔ بہت ہی اچھے پیرائے اور انداز میں کتاب کو تالیف کیا ہے۔ عبدالحق مرحوم پر ابھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ علمی کام تو ظاہر ہیں لیکن اُن کو جاننے اور ان کی شخصیت کو پہچاننے کے لیے اُن کے شخصی اور ذاتی حالات پر زیادہ سے زیادہ لکھنے اور ان کو جمع کرنے کی ضرورت ہے، مخصوصاً پاکستان میں اُن کے آنے اور اس ''انجمن'' کو بنانے اور یہاں رہنے اور کام کرنے کی رُوداد، ابھی اور مکمل کرنے کی ضرورت ہے۔

زندگی میں مجھے فرصت بہت کم ہے، بلکہ نہیں ہے۔ اگر کبھی ملی تو میں فقط اپنے وہ خط شائع کروں گا جن میں مولانا (کی) یہاں کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً:

۱۔ قاضی اختر جوناگڑھی مرحوم کے خطوط۔
۲۔ ہاشمی فرید آبادی کے خطوط۔
۳۔ شمّر حاتمی کے خط۔
۴۔ مولانا (عبدالحق) اور مجلس نظماء کے مابین غلط فہمیاں۔

بہت سے پردے ہٹ جائیں گے اور مولانا کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آئیں گے۔

بہر حال آپ نے بڑا کام کیا ہے، مبارک ہو اور آئندہ بھی اُمید ہے (کہ) اِس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

والسلام: حسام الدین راشدی

حواشی اور حوالے

۱۔ مولانا رازق الخیری، ولادت: دہلی ۱۹۰۹ء، وفات: کراچی ۲۴ دسمبر ۱۹۷۹ء- احوال و خدمات کے لیے دیکھیے: دبستانوں کا دبستان کراچی، حصہ اول، تالیف: احمد حسین صدیقی، مطبوعہ کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۶-۱۷۸۔

۲۔ پروفیسر سیّد وقار عظیم، ولادت: الہ آباد دسمبر ۱۹۰۹ء، وفات: لاہور ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء، مزید دیکھیے: شخصیات اور ادبیات، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور ۱۹۹۵ء، ص ۵۷-۱۱۹۔

۳۔ صادق الخیری، ولادت: دہلی ۱۹۱۵ء، وفات: کراچی ۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء، مزید دیکھیے: دبستانوں کا دبستان، کراچی، حصہ اوّل، ص ۲۶۹-۲۷۱۔

۴۔ پیر سید حسام الدین راشدی، ولادت: بھمن گوٹھ، لاڑکانہ، ۲۰ ستمبر ۱۹۱۱ء، وفات: ۱۲ اپریل ۱۹۸۲ء، مزید دیکھیے: دبستانوں کا دبستان کراچی، حصہ اول، ایضاً، ص ۱۳۶-۱۳۸۔

۵۔ اسد اللہ شاہ: صاحبِ قلم، دانشور، سابق سیکریٹری سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد سندھ۔

۶۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (۵ نومبر ۱۹۴۲ء)، قیام: الوقار، ۵۰ لوئر مال، لاہور، مزید دیکھیے: نذر معین، مرتبہ محمد سعید، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۷۔ ''مجلس'' سے مراد ہے، 'مجلس یادگارِ حمید احمد خان' جو پروفیسر سید وقار عظیم کی تحریک پر قائم ہوئی تھی اور وقار عظیم کے انتقال (نومبر ۱۹۷۶ء) کے بعد فعّال نہ رہی۔

۸۔ پروفیسر حمید احمد خان (وفات، لاہور ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء) کی جانب اشارہ ہے۔

۹۔ ''نمین زندگی'' میں شامل مضامین کے علاوہ سندھی میں غالب پر بعض دوسرے حوالوں کے لیے دیکھیے: غالب پیمائی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، ۱۹۹۸ء، ''غالب۔ سب اچھا کہیں جسے'' (کرار حسین کے کتابچے) کا سندھی ترجمہ بھی چھپا۔

۱۰۔ دو کتابیں پیر صاحب کی خدمت میں بھیجی گئی تھیں: نقد عبدالحق، مرتبہ سید معین الرحمٰن مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۸ء اور اختر وقار عظیم کی کتاب: شبلی بحیثیت مورّخ، مطبوعہ، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

۱۱۔ اختر وقار عظیم: موجودہ مصروفیت: ایم ڈی، پی ٹی وی اکیڈمی، اسلام آباد۔

۱۲۔ ''دودِ چراغِ محفل''، مطبوعہ ادارۂ یادگار غالب، کراچی، ۱۹۶۹ء۔

۱۳۔ ''اشاریہ'' سے مراد ہے ''اشاریۂ غالب''، از: سید معین الرحمٰن، مطبوعہ، لاہور ۱۹۶۹ء۔

۱۴۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی کے معتمد میرزا ظفر الحسن، ولادت: سنگاریڈی ۳ جون، ۱۹۱۶ء، وفات: کراچی، ۴ ستمبر ۱۹۸۴ء۔

۱۵۔ ''کتاب'' سے مراد ہے: مطالعۂ یلدرم: سید معین الرحمٰن، لاہور ۱۹۷۱ء۔

۱۶۔ پیر صاحب کی کتاب: ''دُودِ چراغِ محفل'' پر تبصرہ، بقلم: سید معین الرحمٰن۔

ڈاکٹر فاروق عثمان

مرزا غالب اور اُردو کی ادبی روایت

مرزا غالب کو اُردو شعر و نثر میں جو مقام ملا وہ خود اُس کے خواہاں تھے اور نہ انہوں نے اس کو کبھی اپنے لیے طرۂ امتیاز سمجھا۔ مقطع میں اگر کبھی کوئی سخن گسترانہ بات آن پڑی ہو تو آن پڑی ہو۔ جس طرح اُنہیں اپنے قاچاری اور سلجوقی حسب نسب پر فخر تھا اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ شدت کے ساتھ فارسی زبان کے ملکہ اور قابلیت پر ناز و افتخار تھا اور اُن کی یہ بات تو اتنی دفعہ دہرائی جا چکی ہے کہ اب اس میں کوئی نیا پن نظر نہیں آتا کہ بقول اُن کے ان کا دیوان فارسی اُردو کے بے رنگ مجموعے کے مقابلے میں ایک گلشن کشمیر کا درجہ رکھتا ہے (نہ جانے گلشن شیراز کیوں نہ کہا) گو انہوں نے شاعری کا آغاز تو اُردو زبان میں ہی کیا لیکن شواہد اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ انہیں اُردو پیڑھی کا شاعر شمار کیے جانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مرزا غالب (پیدائش ۱۷۹۷ء) نے لگ بھگ ۱۸۱۳ء سے اور ایک روایت کے مطابق (۱۸۰۶ء) سے شعر کہنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو کی شعری روایت (قلی قطب شاہ سے لے کر مرزا غالب اور ذوق تک) تقریباً دو سو پونے تین سو سال کا سفر طے کر کے ایک اپنا رنگ ڈھنگ، طرز اور اُسلوب قائم کر چکی تھی۔ ایک کثیر شعری سرمائے کی شکل میں اظہار اسالیب متعین ہو چکے تھے اور یہ بات بہت سے سیاسی احوال اور کوائف کے ساتھ شامل ہو کر مستقبل کا یہ نظارہ دکھلا رہی تھی فارسی شعر و ادب کی بساط لپٹ چکی، آنے والا عہد اُردو شعر و ادب کا عہد ہوگا۔ دلی کا نقشہ بھی کچھ علیحدہ نہیں تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے صرف بارہ سال بعد محمد شاہ کے عہد تک آتے آتے دربار کے ساتھ ساتھ دلی کے گلی کوچوں میں اُردو شاعری کا چرچا ہونے لگا تھا۔ ولی دکنی انہیں دنوں تو اپنے دیوان کے ساتھ دلی پہنچے تھے۔ یہ بات بھی اب ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ جس قوم (فرنگی) کے ہاتھوں میں اب ہندوستان کی زمامِ اقتدار کا آنے والی ہے وہ فارسی کے مقابلے میں اُردو کو یہاں کے عوام سے ادبی و سیاسی سطح پر رشتہ جوڑنے واحد ذریعہ سمجھے ہوئے ہے۔ (فورٹ ولیم کالج کا قیام اور اس میں ہونے والے تراجم کے مقاصد پیش نظر رہیں) غالب نے جب شعر کہنے کا آغاز کیا تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنی ساری بیدار مغزی کے باوصف اس ادبی منظر نامے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی شعری کاوشوں کا سلسلہ براہِ راست اُس مقام سے جوڑا جہاں عہدِ شاہ جہانی اور عہد عالمگیری کے سبک ہندی کے شاعر کھڑے تھے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ انہوں نے میر، سودا، درد سے رشتہ جوڑنے کی بجائے میرزا عبدالقادر بیدل اور ناصر علی سرہندی کی فکری اور فنی روایت سے اپنے آپ کو منسلک کیا۔ اورنگ زیب کی وفات سے لے کر غالب تک آتے آتے اس سو سالہ دَور میں اُردو و فارسی کے اسالیب اظہار میں جو ایک نمایاں خلیج آ چکی تھی

میرزا صاحب نے اُس کا بالکل لحاظ نہیں رکھا۔ ولی، میرؔ، درد اور اُن کے بعد آنے والوں نے جذبے اور اُس کے اظہار کی خاطر سادگی اور سلاست میں گندھے ہوئے جس متوازن اُسلوب کو ایک روایت کے طور پر پروان چڑھایا تھا اُس میں اور سبک ہندی کے آخری دَور کے شعرا کی قائم کردہ مغربی اصطلاح میں (Rococo) شعری روایت میں ایک بُعد قطبین آ چکا تھا۔ مرزا غالب نے تقریباً سو سالہ اور ایک لحاظ سے دو سو سالہ ریختہ گوئی کی روایت کو پسِ پشت ڈال کر اِسی مغلق اور نازک خیالی (Rococo) کی فراموش کردہ روایت سے جوڑا نتیجہ بقول حمید احمد خان ''غالب سب سے پہلی بات جو یاد رکھنی چاہیے یہ ہے کہ اُن کا سلسلہ نسب براہِ راست فارسی گو شعرا سے ملتا ہے ولی اور میرؔ کی نسل سے کم از کم اپنے پہلے دَور میں اسے کوئی تعلق نہیں اس کے ابتدائی اشعار دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے گویا یہ احساس ہی نہیں تھا کہ میر کے نام کا بھی کوئی شخص ہو گزرا ہے۔ ممکن ہے آپ اسی طرز اظہار سے اختلاف کریں لیکن پھر بھی ایک بات تو اظہر من الشمس ہے کہ اُن کے ہاں ریختہ گوؤں کی روایت کے تسلسل کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اسی سلسلے میں اُن پر تنقید ہوتی رہی لیکن مرزا نے ایک وقت تک تو اِسے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ ایک طرف تو مغلق تشبیہات و استعارات، وہمی اور خیالی تراکیب، ثقیل اور غیر الفہم زبان کو دہلی کے ادب فہم طبقے میرؔ اور دردؔ کی شعری روایت کے تسلسل میں کسی طرح اُردو کا نام دینے کو تیار نہ تھے اور دوسری طرف مرزا صاحب کو اُن کا احساسِ تفاخر ان شعرا کی صف میں مل بیٹھنے سے روکتا تھا۔ اس زمانے میں اُن کی شاعری کی بنیاد کسی بڑے شعری تجربے کی بجائے فلسفیانہ ذہنی کاوش پر رکھی نظر آتی ہے جتنی تنقید ہوتی اتنا وہ اِس صورت حال میں گہرے اترتے چلے جاتے وہ اتنا آگے نکل گئے کہ اپنی شاعری کو پہنچنے والے نقصان کا بھی احساس نہ رہا۔ ایک وقت آیا کہ اُنہوں نے تسلیم کیا۔ عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ''۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دُور کیا اور اوراق یک قلم چاک کیے دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔''

گویا ۱۸۱۲ء سے ۱۸۲۲ء تک کی شاعری خود اپنے ہاتھ سے تلف کر دی صرف دس پندرہ شعر رہنے دیئے لیکن ان دس پندرہ اشعار کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ کون سے ہیں کیونکہ تمیز آنے کے باوجود یہ تبدیلی کوئی انقلاب انگیز نہیں تھی۔ بہت سا حصہ دیوان حال میں بھی ایسا ہے کہ جس کا رشتہ حسبِ سابق (البتہ ذرا زیادہ فنی چابک دستی اور کمال کے ساتھ) سبک ہندی کی فارسی شعری روایت سے ہی ملتا ہے۔ وہی نازک خیالی وہی خارجی موجودات سے بحیثیت خارجی موجوات دلچسپی اور خارجی مشاہدات کا رشتہ خیال سے اتنا دُور افتادہ اور باریک بینی پر مبنی کہ بعض اوقات تو خیال ایک ہلکے سے پرتو کی طرح نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جو ہندوستان کے ریختہ گوؤں کے لیے ناقابلِ فہم تھی وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ مرزا نوشہ ایک ایسا شاعر ہے جو اُردو میں شاعری کرتا ہے مگر اُردو اور فارسی میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا۔ ریختہ گو شعرا کی روایات سے قطع نظر کر کے فارسی شعرا کے دوش بدوش کھڑا ہونے کی کوشش

کرتا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں لکھتے ہیں ''وہ شاعرانہ روایات جو ایک سو سال کی سخن پردازیوں کا ماحصل تھی ایک طفلِ ناآزمودہ کار کی مدعیانہ للکار کو خاموشی سے نہیں سُن سکتی تھی۔'' (ممکن ہے پروفیسر موصوف کے الفاظ ہمیں ذرا تلخ محسوس ہوں لیکن مرزا غالب کے جن نسلی اور لسانی تعصّبات کا اِن کے پیچھے ہاتھ ہے، اُن کو دیکھتے ہوئے یہ الفاظ ایسے سخت بھی محسوس نہیں ہوتے)۔ نتیجہ یہ کہ وہ اطراف و جوانب سے حملوں میں گھرے رہے پھر بالآخر اس چپقلش سے تنگ آ کر ۱۸۲۱ء کے قریب بقول حمید احمد خان اپنی عنان تخیل ریختہ گوئی کے میدان سے ایک حقارت آمیز انداز کے ساتھ ہمیشہ کے لیے پھیر لی لیکن یہ عزم آخر تک قائم نہ رہ سکا۔ تقریباً ۱۸۵۰ء میں تیس سال بعد بہادر شاہ کے دربار سے تعلق قائم ہوا تو وہ اُردو شعر کی طرف متوجہ ہوئے یہ واپسی بھی اُن کے لیے باعثِ افتخار نہیں تھی اُنہوں نے کبھی مجموعہ بے رنگ کہا اور کبھی حکومتِ وقت کی بھٹئی کہہ کر ایک استحقار کا رویہ ظاہر کیا۔ علاؤالدین احمد خان علائی کو لکھتے ہیں: ''گورنمنٹ کا بھاٹ تھا بھٹئی کرتا تھا اور خلعت پاتا تھا خلعت موقوف بھٹئی متروک نہ غزل نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین نہیں پھر کیا لکھوں۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں دربار موقوف مشاعرے ہوتے نہیں غزل کیا لکھی جائے۔ اس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ اُردو شاعری محض بھٹئی تھی غزل دربار کی مجبوری تھی شاعری کا یہ سارا عمل کسی اندرونی تحریک کا نتیجہ نہ تھا۔ واللہ اعلم۔۔۔

فارسی زبان و شعر و ادب سے والہانہ وابستگی خطوط میں جگہ جگہ ظاہر ہوتی ہے: ''تم نے دستاتیر مجھ سے مانگی اس صحیفۂ مقدس کی قسم وہ میرے پاس نہیں ہے۔'' یہاں دساتیر کو صحیفہ مقدس ہی نہیں کہا اُس کی قسم بھی کھائی ہے۔۔۔

''بہت اتراتا تھا میں بڑا شاعر ہوں اور فارسی دان ہوں آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔''

قرینہ تو یہی بتاتا ہے کہ شاعر سے بھی یہاں مراد فارسی زبان کا شاعر ہی مرزا صاحب مراد لے رہے ہیں۔

''اہلِ ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔۔۔'' اگر آپ کہیں پوچھ بیٹھیں گے کہ حضرت مرزا نوشہ آپ بھی تو اہلِ ہند میں شمار ہوتے ہیں تو پھر جواب بڑا مدلل آئے گا۔

''مجھ میں اور اہل پارس میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک تو اُن کا مولد ایران ہے اور دوسرا وہ مجھ سے دو چار سو سال پہلے پیدا ہوئے ہیں۔۔۔'' اب مسلم الثبوت ہونے کی اس سے بڑی بُرہانِ قاطع اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔۔۔

''ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا اُردو کی فکر کو مانع آتا تھا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا تھا۔۔۔ یہ بھی اُنہیں میں ایک ہے جن کا میں ماتمی ہوں۔''

''میاں تمہاری جان کی قسم میرا اب ریختہ لکھنے کو جی چاہتا ہے اور نہ مجھ سے کہا جاتا ہے۔''

فارسی اور اہلِ فارس سے یہ وابستگی اور والہانہ پن تو کبھی کبھی اِس حد تک غلو کر جاتا ہے کہ تاریخی

حقائق کو مسخ کر جاتا ہے۔ مولانا ضیاالدین خاں ضیا دہلوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ''دو تین ہزار برس قبل آج کے عرب و عجم بے گانہ، ہم دگر ہے اہل پارس اپنے مطالبِ علم کو بلکہ علومِ متنوعہ کو کس زبان میں شروع کیا کرتے تھے۔ تعلیم و تعلم اور سوال و جواب کا مدار کن الفاظ پر ہوگا بلاشبہ وہ الفاظ پارسی ہی ہوں گے جب خلیفۂ ثانی کے عہد میں یزدگرد مارا گیا اور پارس پر عرب مسلط ہوئے۔ درفش کاویانی کا جواہر آمیز چمڑہ پارہ پارہ ہو کر غازیانِ اسلام میں بٹ گیا کتاب خانے پارس کے کیا بادشاہی اور کیا رعایا کے چولہے میں جھونکے گئے یعنی ان سے حمام گرمے ہوئے جیسا کہ میں نے اس واقعہ کو ایک جگہ فارسی عبارت میں لکھا ہے وہی ہذا کتاب خانہ ہائے پارسیاں افروزینۂ گلخن گرمابۂ ہائے بغداد ہمانا احکامِ آتش پرستی ہم بہ آتش بازگشت۔۔۔''

اس خط کے لب لہجہ کی متعصّبانہ تلخی اور اندرونی کاٹ سے قطع نظر ذرا ان حقائق پر غور کیجیے۔ یزدگرد خلیفہ سوم نہ کہ دوم کے دَور میں مراد وسرا ایران کے کتب خانے جلانے اور اُن سے حمام گرم کرنے کی بات اُتنی ہی بے پر کی ہے جتنا فتح ایران کے وقت بغداد کا تذکرہ۔ بغداد کا تو اُس وقت وجود ہی نہیں تھا۔ یہ فارس اور اہل فارس کی محبت کا غلو ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

دوسری طرف زبانِ ہند اور اہلِ ہند سے لاتعلقی کا یہ عالم ہے کہ لہجہ سے تحقیر کا احساس ہوتا ہے۔ ذوق کا شعر تحریر کرتے ہیں لیکن صرف اس حوالے کے ساتھ کہ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔ صرف دو رسالے اُردو نثر میں سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی طبع کرائے دونوں اپنے نام سے نہیں چھپوائے ایک عبدالکریم کے نام سے چھپا اور دوسرا میاں دادخاں سیاح کے نام سے دوسری طرف دیکھا جائے تو بہ اہتمام دل و جاں دستنبو کی تحریر و اشاعت میں مشغول نظر آتے ہیں اور خطوط میں اس کا تذکرہ بھی جا بجا ملتا ہے: ''میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک رودادِ شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اِس کا یہ کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے، ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے وہ عربی انگریزی ہندی جو ہیں لکھ دیئے ہیں۔''

مجھے ذاتی طور پر اس کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آیا کہ مرزا غالب نے ۱۸۵۸ء میں ایامِ غدر کا ایک روزنامچہ تحریر کیا اور اس اہتمام کے ساتھ لکھا کہ قدیم پارسی اور ایسی پارسی لکھی جائے کہ جو بے آمیزش لفظِ عربی ہو (سرسید احمد خان جن کو آئین اکبری کی تدوین پر وقت کو پہچاننے کا مشورہ مرزا غالب نے دیا تھا انہوں نے بھی ایسا نہیں کیا تھا اسبابِ بغاوت ہند انگریزی میں لکھوائی۔۔۔) وہ اس طرح کی نثر لکھ کر کیا ثابت کرنا چاہتے تھے حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ اس کا لکھنا پڑھنا اور سمجھنا عام الناس تو کیا حکام بالا کہ جن تک پہنچانے کے لیے وہ نہایت بے تاب نظر آتے ہیں، کے لیے بھی ناممکن ہوگا۔ چنانچہ منشی شیونرائن کو جو اِس کتاب کی طباعت اور اشاعت میں نمایاں تھے لکھتے ہیں: ''یہ تم نے لکھا کہ صاحب نے اس کو سُن کر پسند کیا میں حیران ہوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہوگا کیونکر کہوں کہ صاحب اس عبارت کو سمجھے ہوں گے

اِس کی جو حقیقت ہے مفصل لکھو۔۔۔''

اِسی کتاب دستنبو کی اشاعت کے سلسلے میں اُن کی جو خط کتابت چلتی رہی اُس سے اُردو زبان کے ساتھ اُن کے رویے کا بڑا واضح اور واشگاف اظہار ملتا ہے۔ ہوا یہ کہ دستنبو کو جناب ہنری ریڈ صاحب ڈائریکٹر تعلیمات یوپی تک پہنچانے کے جب منشی شیونرائن نے مشورہ دیا تو اُسے لکھتے ہیں: ''جناب ہنری ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا اُن کی فرمائش ہے اُردو نثر وہ انجام پائے تو اُس کے ساتھ اُن کو خط لکھوں۔'' اب ذرا نثر نہ لکھنے کی وجوہات پر بھی غور کیجیے۔ مرزا صاحب کے خط سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ ریڈ صاحب نے کہانی، حکایت یا داستان کی طرح کی کوئی چیز لکھنے کے لیے ہوگا جو غالباً تدریسی مقاصد کے لیے لکھوانا چاہتے ہوں گے۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب مرزا صاحب میر امن، مرزا رجب علی بیگ سرور، بوستان خیال داستان امیر حمزہ جیسی کتابوں کا مطالعہ کر چکے اور بوستانِ خیال پر تو انہوں نے ایک دیباچہ بھی تحریر کیا تھا جو آج بھی بعض ناقدین کی نظر میں داستان اور افسانے کے رموز پر لکھی جانے والی ابتدائی تنقیدی تحریر تصور کی جاتی ہے لیکن وہ اس ادبی روایت میں ایک نثر نگار کی حیثیت سے شامل ہو کر اسے آگے بڑھانے پر تیار ہی نہیں، اسے اپنے مقام، منصب اور مرتبے کے منافی تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ منشی شونرائن کو لکھتے ہیں: ''مگر بھائی تم غور کرو اُردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معنی نازک کیونکر بھروں گا۔۔۔ ابھی تو میں سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں کون سی بات کون سی کہانی لکھوں، کون سا مضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر کروں۔۔۔۔'' دوبارہ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''ریڈ صاحب کے باب میں مَیں نے لکھا تھا کہ جب اُردو نثر ان کے واسطے لکھ لوں گا تو دستنبو کی خریداری کی خواہش کروں گا لہٰذا تم سے صلاح پوچھی تھی کہ کس حکایت کس روایت کو فارسی سے اُردو کروں۔ تم نے اس کا بھی جواب نہ لکھا۔''

آخر جب ادھر سے اصرار بڑھا تو زچ ہو کر لکھتے ہیں: ''جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے، بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ میرا اُردو نسبت اوروں کے اُردو کے فصیح ہوگا۔ خیر بہر حال کچھ کروں گا اور اُردو میں اپنا زورِ قلم دکھاؤں گا۔''

بالآخر واشگاف لفظوں میں جواب دیتے ہیں: ''میاں اُردو کیا لکھوں میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو خیر ہوئی اب میں کہانیاں قصے کہاں ڈھونڈتا پھروں۔۔۔'' اس جواب کے ساتھ وہ جو ایک اُمید بندھی تھی کہ میر امن کی نثری روایت شاندار انداز میں ایک گہرے تنقیدی شعور کے ساتھ آگے بڑھے گی ___ بسا آرزو کہ خاک شدہ ___ اُردو شاعری اُن کے لیے بھٹی تھی نثر اُن کے منصب کے منافی تھی ہماری اُردو نثر کی بدقسمتی کہ ایک شاندار موقع اُن کے نسلی تفاخر اور لسانی تعصب کی نذر ہو گیا جہاں تک اُردو خط نویسی کا تعلق ہے یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ وہ ان کے اشاعت سے پہلو تہی کرتے رہے اور یہ لکھا کہ ''یہ بات میری شہرت کے منافی ہے'' اور دوستوں کے اصرار کو اپنے خلاف اُن کی ''زاید بات'' قرار دیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر مظفر عباس

دورِ حاضر کی پاکستانی شاعری میں عصری مسائل کا ادراک

پاکستانی شاعری دورِ حاضر میں سماجی و سیاسی شعور کی پختگی میں داخل ہو چکی ہے۔ اس جدید دَور کا آغاز فیض احمد فیض کی شاعری سے ہوتا ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری نے پاکستان کی جدید شاعری کو سیاسی و سماجی شعور کی اساس مہیا کی ہے۔ فیض کا نظریۂ شعر ہی حریت فکر اور آزادی افکار سے عبارت ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے — کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے — ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اُردو شاعری میں سماجی و سیاسی شعور کی رو در حقیقت شاعری کے آغاز ہی کے ساتھ ہی نمایاں ہوتی نظر آتی ہے چنانچہ سماجی و سیاسی شعور کے ادراک کی اس روایت کا آغاز در حقیقت بہت پہلے انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہو چکا تھا۔ اس کا بنیادی محرک ہندوستان میں انگریزی تہذیب اور سیاست کے اثر و نفوذ کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ اس شعور میں ارتفاع کی کیفیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اُردو میں شہر آشوب کی روایت کو اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں مرزا سودا کے مخمس شہر آشوب کے یہ اشعار بطور مثال دیکھیے جو انیسویں صدی کے ہندوستان کے سماجی و سیاسی شعور کی بخوبی نشان دہی کرتے ہیں۔

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف — ٹلے کہاں ہیں جو ہم دے کے ہوں انہوں سے حریف
نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیان خریف — جو عامل اب ہیں محالات پر سو یوں ہیں خفیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو اول

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا — کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا — نہیں ہے فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

صرف شاعری ہی تک محدود نہیں اس دَور کی نثر میں بھی سماجی و سیاسی شعور کی واضح جھلکیاں ملتی ہیں اور اس کی سب سے بڑی مثال غالب کے مکاتیب ہیں جو نہ صرف اُردو نثر کے جدید دَور کا نقطۂ آغاز ہیں بلکہ اپنے دَور کے سماجی و سیاسی حالات کے شارح بھی۔ یہاں ان کے مجموعے ''اردوئے معلیٰ'' سے ایک مثال دیکھیے: ''مبالغہ نہ جاننا' امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی

میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔''

بیسویں صدی میں علامہ اقبال کی شاعری نے ان رجحانات کو مہمیز کیا۔ علامہ اقبال کا تو پورے کا پورا کلام ہی برصغیر پاک و ہند کے سماجی و سیاسی شعور کا شارح ہے ان کے مجموعہ کلام ''ضرب کلیم'' کا تو بنیادی موضوع ہی یہی ہے۔ اس کے سرورق پر درج یہ عبارت اسی جانب اشارہ ہے:

''اعلان جنگ دورِ حاضر کے خلاف''

ان کی نظم ''صقلیہ'' کا یہ بند دیکھئے جس میں شاعر اسلامی تہذیب کے اہم مراکز کی تباہی پر ماتم کرتا ہوا نظر آتا ہے:

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر — داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر
آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی — ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی
غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا — چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

اس پس منظر میں جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض کے ساتھ ساتھ ان کے دیگر معاصر پاکستانی شعراء ن۔م۔راشد، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، مجید امجد، مختار صدیقی، احسان دانش، صوفی تبسم اور سید عابد علی عابد مختلف اور متنوع اسالیب شعر رکھنے کے باوجود عصری مسائل کے ادراک و اظہار میں ہم مسلک ہیں۔ ان پاکستانی شعراء کے یہاں عصری مسائل اور قضیوں کے مختلف عکس، کبھی فلسطین، کشمیر، چیچنیا اور افریقی اقوام کی آزادی کی تحریکوں کی گونج کی صورت میں تو کبھی دنیا میں انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف احتجاج کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ یہاں احمد ندیم قاسمی کی ایک تازہ طویل نظم ''کائناتیں'' کا یہ بند ہماری بات کی تائید کے لیے کافی ہے:

ابھی ابھی
گلی میں ایک طفل پانچ سال کا
کتابوں کا ایک ڈھیر پیٹھ پر لیے ہوئے، سکول جا رہا تھا
اس کی بیوہ ماں نے ردی کاغذوں کے جو لفافے کتنے روز میں بنائے تھے
انہیں کسی دوکان پر فروخت کر کے اپنے بیٹے، اپنی آخری اُمید کے لیے
نئی کتابیں اور کاپیاں کچھ ایسے جذبے سے خرید لائی تھی
کہ جیسے پوری کائنات ہی سمیٹ لائی تھی

اس سے آگے آنے والی نسل کے پاکستانی شعراء بھی اسی طرزِ احساس کے مقلد نظر آتے ہیں بلکہ ان کے یاں تو یہ احساس اور بھی بھرپور، واضح اور دوٹوک انداز میں ملتا ہے۔ اب اردگرد اور دنیا کے دیگر

خطوں میں رونما ہونے والے واقعات ان کی شاعری کا براہِ راست موضوع بنتے ہیں اور یہ ان واقعات پر بلا جھجک اور بے خوف و خطر تبصرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ احمد فراز اس گروہ کے سرخیل ہیں۔ وہ فیض احمد فیض سے بہت متاثر ہیں اور ان کی شاعری پر بھی فیض کے گہرے اثرات ہیں۔ اس دَور کے دیگر شعراء میں حبیب جالب، قتیل شفائی، منیر نیازی، جیلانی کامران، سلیم احمد، محمود شام، کشور ناہید، تبسم کاشمیری، افتخار جالب، عباس اطہر اور حسن رضوی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

پاکستانی جدید ترنسل کے شاعروں کے کلام کو تو بجا طور پر روح عصر کا نقیب کہا جا سکتا ہے معاصر صورت حال کا ادراک اور تفہیم ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ اکیسویں صدی کی دنیا چونکہ گلوبل ولیج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لہٰذا اب ان کی اُڑان صرف اپنے خطے تک محدود نہیں ہے۔ دنیا کے کسی بھی مقام پر رونما ہونے والا واقعہ اب ان کی شاعری کا موضوع بن سکتا ہے۔ اسی لیے فلسطینی انتفاضہ، نائن الیون، افغانیوں پر امریکی یورش، اسرائیلی جارحیت، کشمیر میں ہندوستانی مظالم اور اب حال ہی میں عراق پر امریکی یلغار پاکستان کی جدید شاعری کے اہم موضوعات میں شامل ہیں۔ جدید پاکستانی شاعروں کی تازہ نظموں سے یہ دو مثالیں ان خیالات کی بخوبی تائید کرتی ہیں:

محاصرہ بڑھ رہا ہے پیہم
نجف میں بصرہ میں
اور بغداد کی فصیلوں میں اب دراڑیں پڑی ہوئی ہیں
زمانہ طاقت کے ناخداؤں کے اک اشارے پہ چل رہا ہے
نئی تباہی کے رُخ پہ کروٹ بدل رہا ہے
خدا کے لہجے میں بات کرتے یہ چند انساں
زمیں کی تقدیر اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہیں
مفاد کی اور غرض کی دنیا انوکھے انصاف پر مصر ہے،
وہ اس زمیں کے چھپے خزانوں پہ اپنے سانپوں کی پہرہ داری کی منتظر ہے
ادھر زمین عراق کہنہ روایتوں کے مہیب صحرا میں
ان گنت بے نشان قبروں کے سلسلوں کو بڑھا رہی ہے،
ادھر وہ قوت سیاہ کثرت،
نئے عزائم کی داستانیں سنا رہی ہے
تحیر آمیز طاقتوں کے ہزار جلوے دکھا دکھا کر
دلوں میں بارود کی سرنگیں بچھا رہی ہے
نئی صدی کے بدن میں سرطان پل رہا ہے

زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے

(شاہدہ حسن: 'زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے')

میں تہذیبوں کا بچپن ہوں، اساطیری روایت کی جوانی ہوں
تمدن کی یہ حوا میری ہی پسلی سے نکلی ہے، مجھی میں دفن کر دینا
میں بابل کا کنواں ہوں،
میں دشت کربلا کی ریت ہوں،
تاریخ کی تشنہ لبی ہوں، جاودانی ہوں
فرات و دجلہ مجھ میں آ کے گرتے ہیں
کہ میں شط العرب ہوں اور پیاسا ہوں
مجھے بغداد کہتے ہیں
مجھے سلمان کی مٹی سے نسبت ہے، غزالی کے قلم کی روشنائی میرا غازہ ہے
صلیب عشق ہوں منصور کے قدموں کی برکت سے،
عروس قریہ ہائے امن عالم ہوں،
مگر ناپاک غارت گر،
مری حرمت پہ حملے کر رہے ہیں، مجھ کو زخمی کر رہے ہیں۔

(ڈاکٹر معین نظامی: بغداد کا نوحہ)

[جامعہ ازہر، قاہرہ (گرلز برانچ) کی بین الاقوامی کانفرنس، منعقدہ ۲۹-۳۰ اپریل ۲۰۰۳ء میں پیش کیا گیا۔]

☆☆☆

غلام حسین ساجد

''سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ'' اور ''تاریخ اور نصابی کتب''
ایک تاثر

ڈاکٹر مبارک علی کو مَیں کم و بیش پندرہ برس سے جانتا ہوں اور یہ بات اِس لیے زیادہ توجہ پانے کی حق دار ہے کہ وہ لمحہ موجود تک میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم و تعلم سے وابستگی رکھنے اور قلم کے مزدور ہونے کے باوصف ہم ایک ہی دنیا کے لوگ نہیں ہیں۔ وہ خردمندی اور خردافروزی کے نامور پیام بر ہیں اور میں محض ایک خواب بننے والا گمنام شاعر۔۔۔ مگر نہیں ہمارے بیچ ایک قدرِ مشترک ایسی ہے جو قربت اور مکالمے کی بنیاد بن سکتی ہے اور وہ قدرِ مشترک ہے، روشن خیالی کی تحریک سے اُن کی وابستگی اور سیّد سبط حسن مرحوم کا پرستار اور پروفیسر سیّد علی عباس جلالپوری مرحوم کا شاگرد ہونے کے ناطے اِس تحریک سے وابستگی رکھنے والوں سے میری غیر مشروط عقیدت۔

ڈاکٹر صاحب تاریخ اور تاریخ سے متعلق موضوعات پر کم و بیش پچاس کتابوں کے مصنّف ہیں۔ اِن میں بعض مرتّبہ کتابیں بھی ہوں گی مگر جب مرتّبہ کتاب بے ریا تحقیقی مشقت اور فکری دیانت کی دین ہو تو میرے خیال میں اُسے بھی تصنیف ہی کے زمرے میں درج کرنا چاہیے۔ اُنہوں نے ''فلسفۂ تاریخ'' سے ''کھانا اور کھانے کے آداب'' تک کی تاریخ لکھی ہے مگر میں اُنہیں اُن کی پی ایچ۔ڈی کے مقالے ''مغل دربار'' کے حوالے سے پہچانتا ہوں۔ جس کے خریدنے اور پڑھنے کا سبب ایک ''مغل بچے'' سے میری قربت تھی۔ میں اُس مغل بچے کی مغلئی اَنا سے تو مایوس ہوا مگر کتاب سے نہیں۔ اس لیے کہ کتاب آج بھی مجھے اپنی طرف بلاتی ہے اور مَیں اِس کے ذریعے مغل دربار کی فضا اور طلسم کو جاننے کی سعی کرتا ہوں۔ اِس کتاب کے علاوہ مَیں انہیں ڈان اور دیگر اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والے کالموں اور مضامین کے حوالے سے بھی جانتا ہوں۔ اِن کا ایک حوالہ گو کتھے انسٹی ٹیوٹ کا بھی تھا مگر وہ ادارہ اب ایک خواب بن چکا اور ڈاکٹر صاحب، خواب اور خواب سے متعلق دنیا کی باتیں پسند نہیں کرتے ہوں گے اِس لیے میں اِس کمی اور دُکھ کا بیان کسی اور وقت پر اُٹھا رکھتا ہوں۔

اِس سہ ماہی میں ڈاکٹر صاحب کی پانچ نئی فکر انگیز کتب بعنوان ''تاریخ کی تلاش''، ''تاریخ کی آواز''، ''تاریخ اور نصابی کتب''، ''سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ'' اور ''انٹرویوز اور تاثرات'' فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہوئی ہیں۔ اِس وقت مجھے جن دو کتابوں پر اپنے ٹوٹے پھوٹے خیالات کا اظہار کرنا ہے وہ ''سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ'' اور ''تاریخ اور نصابی کتب'' ہیں۔ ان میں سے ''سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ، یورپی سیاحوں کی روشنی میں'' ایک مرتّبہ کتاب ہے، جسے سعود الحسن خان نے ترجمہ کیا ہے،

جب کہ ''تاریخ اور نصابی کتب'' ڈاکٹر صاحب کی اپنی تصنیف ہے اور یہ اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو تاریخ کے مضمون کو سیاسی و مذہبی اور قومی مفادات کے تحت لکھنے اور نصابی کتب میں کھپانے کے اثرات کا تجزیہ کرنے کی غرض سے لکھے گئے اور ملک کے موقر اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے۔ اِس کتاب میں ڈاکٹر مبارک علی نے نصابی کتب میں تاریخ کو ریاستی مقاصد کے تحت مسخ کرنے اور طلبہ کی بَرین واشنگ کا ذریعہ بنانے ایسے پیچیدہ مسائل کو چھیڑا ہے اور کوشش کی ہے کہ قارئین اپنے حکمرانوں کا اصل چہرہ دیکھنے کے ساتھ ساتھ تاریخی حقّانیت سے بھی آگاہ ہوں اور ریاست، مذہب اور سیاستدانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے کے بجائے اپنی فکر، دانش اور رائے کو بروئے کار لانے کے قابل ہوسکیں۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش ایک ایسا جہاد ہے کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔

اصل میں ڈاکٹر مبارک علی کی ساری کتابوں اور اُن کی فکری جدوجہد کا حقیقی رُخ، ہم تاریخ سے بچھڑے ہوئے اور مسخ شدہ تاریخ کی پیروی اور حفاظت کرنے والے لوگوں کو تاریخ کا اصل چہرہ دکھانے اور فلسفۂ تاریخ سے آگاہ رکھنے کی طرف ہے۔ ڈاکٹر صاحب جانتے ہیں کہ مسخ شدہ تاریخ کی تطہیر کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ عوام میں تاریخ اور ریاستی جبر کی تفہیم کرنے کا ادراک پیدا کرنا ہے۔ خرد افروزی اور روشن خیالی سے وابستہ حکما کی اصل پہچان اِسی وطیرے سے ہے۔

''سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ'' سے پہلے ڈاکٹر صاحب ''سندھ- خاموشی کی آواز'' بھی شائع کر چکے ہیں۔ سندھ سے اُنہیں خاص نسبت ہے اور ہونی بھی چاہیے کہ سندھ کی ثقافت، تاریخ اور سماجیات کو جانے بغیر ہندوستان اور اب پاکستان کی فکری بنیادوں کا جاننا ممکن نہیں کیونکہ سندھ تہذیبی ارتقا اور فکری تنوع کی بنیاد بھی ہے اور علامت بھی۔ یوں بھی ہوائی سفر کے آغاز سے پہلے سمندر سے جڑی اقلیمیں خاص طرح کی فضیلت رکھتی تھیں اور اِسی بنیاد پر وہ طالع آزماؤں کی دستبرد کا شکار بھی رہتی تھیں اور نَو بہ نَو فکری رویوں کی پیکار اور پرداخت کا میدانِ خاص بھی۔ سندھ (اور یہ بات مَیں موجودہ سندھ نہیں، تقسیم سے پہلے کے سندھ کے بارے میں کہہ رہا ہوں) بھی اِس تنوع کی طالع آزمائی کا شکار رہا ہے۔ اِس لیے وہاں مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا وسیع پیمانے پر ادغام ہوتا رہا ہے۔ سندھ کی تاریخ کو جاننا، ہندوستان بھر کی تاریخ اور فکری ارتقاء کے تسلسل کو سمجھنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ وہ رگ وید، اوستا اور رامائن کی سرزمین بھی ہے اور قرآن مجید کا شعور رکھنے اور اُسے پھیلانے والا خطہ بھی- دیکھئے تو سندھ کے دروازے ہمیشہ فکرِ نو اور صبحِ جمیل کی طرف کھلے رہتے ہیں۔ سو ڈاکٹر مبارک علی جیسے روشن دماغوں کے لیے سندھ کی طرف پلٹ کر دیکھنا ضروری تھا۔

''سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ'' یورپی سیّاحوں کے بیانات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ اِس کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر صاحب نے اِس کتاب کے قاری کو بجا طور پر متنبہ کیا ہے کہ وہ سیاحوں کے بیانات اور اُن کے تاثرات کو قبول کرنے سے پہلے اِس بات کو سمجھ لے کہ سیاح دوسرے معاشروں اور اُن کی ساخت و سرگرمیوں کو اپنی روایات، اقدار اور تعصّبات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کے

اپنے مختصر قیام کے عرصہ میں اُن کے لیے معاشرے کی اندرونی تشکیل اور رجحانات کو پوری طرح سمجھ پانا ممکن نہیں ہوتا۔ اِس کتاب میں عہدِ مغلیہ سے تالپور عہد (۱۵۹۲ء تا ۱۸۴۳ء) تک کی سماجی و ثقافتی سرگرمیوں کی منظر کشی کی گئی ہے اور اِسے ڈاکٹر صاحب نے جغرافیہ، لوگ، شہر، حکمران اور دربار اور انتظامیہ اور دربار کے ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ یورپی سیاحوں کی منتشر اور باہم مدغم آراء کو اِن ابواب میں تقسیم کر کے ڈاکٹر صاحب نے اُس کمی کا ازالہ کیا ہے جو حکمرانوں کی شہ پر لکھی جانے والی ہم عصر تاریخوں میں موجود رہتی ہے۔ یعنی کسی خطے کی سماجی و ثقافتی زندگی کی جھلک۔ اور یہ بات میں اِس بات کو ذہن میں رکھ کر کر رہا ہوں کہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں سندھ، خود شناسی، لسانی شعور اور جڑوں کی تلاش میں نکلنے والے صوبے کے لحاظ سے باقی تینوں صوبوں پر غیر معمولی فوقیت رکھتا ہے اور سندھ کی تواریخ جس محبت، محنت اور جدلیاتی شعور کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ کم از کم پنجاب کی حد تک اُس کی کوئی مثال ڈھونڈ لانا ممکن نہیں۔

عہدِ مغلیہ سے تالپور عہد تک سندھ کی سیاحت کرنے والے یورپی سیاح متعصب ہو سکتے ہیں اور ہیں۔ خصوصاً سندھ کے باسیوں کی کاہلی، حکمرانوں کی ہندو دشمنی، توہمات اور مذہبی تعصّبات کے بیان میں غلو سے کام لیا گیا ہے اور شاید اس کا سبب، سرزمینِ سندھ اور اُس کی سیاحت کرنے والوں کے مابین تہذیبی تفاوت کا موجود ہونا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اُن سیاحوں کو حکمرانوں کے منشا و مرضی کے مطابق چلنے اور ریاستی/سرکاری رائے کو درج کرنے کی ضرورت ہے نہ مجبوری۔ اُن کی رائے کتنی ہی متعصّبانہ، برخود غلط اور عجلت میں مرتب کیوں نہ کی گئی ہو۔ بہر طور اُن کے ذاتی احساس پر مبنی ہے اور وہ ریاست کے فکری بہاؤ کے ساتھ چلنے سے زیادہ عوامی زندگی کے بہاؤ اور اُس کے شب و روز کے مطالعے کی بنیاد پر درج کی گئی ہے اور یہ نعمت ہے جو ہمارے حکما کی لکھی ہوئی تاریخ کی کتابوں میں عنقا ہے۔ سو یہ ظاہری اور عجلت میں دی گئی بڑی حد تک متعصّبانہ آراء بھی سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں اور سندھ کا اصل چہرہ دیکھنے کی خواہش والوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور اُن کو یک جا کرنے اور شائع کرنے کا یہی جواز ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کو یورپی سیاحوں کے تاثرات میں سانس لیتے تعصب کا بخوبی احساس ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اِس تاثرات کی تطہیر کرنے اور سندھ کی منفی تصویر کشی کے توڑ کے لیے بھی ایک کتاب تصنیف کریں گے کہ اس عہد میں اِس نوع کے چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے سب کی نگاہ اُنہی کی طرف اُٹھ جاتی ہے اور جب تک روشن خیالی کا دور دورہ نہیں ہوتا انہیں اِس نوع کے سوال اُٹھانے اور اُن کے شافی جواب دینے کے سلسلے کو جاری رکھنا ہی ہوگا۔

اور اب آیئے چند باتیں اُن کی دوسری کتاب ''تاریخ اور نصابی کتب'' کے حوالے سے کی جائیں جو ڈاکٹر صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اِن مضامین میں انہوں نے ایک بہت حساس مسئلے کی طرف توجہ دِلائی ہے اور اس امر کو واضح کیا ہے کہ ریاست اور ارباب بست و کشاد، اپنے مفاد کے لیے نصابی کتب میں تاریخی حقائق کو کس طرح مسخ کرتے ہیں اور ان مسخ شدہ حقائق کے ذریعے نوجوان ذہنوں کو تبدیل کر کے، اُنہیں کس طرح تعصب، منافرت اور عناد کی راہ پر چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اِس کتاب

کے ذریعے ڈاکٹر مبارک علی نے نصابی کتب میں تاریخ کو سیاسی، مذہبی، قومی اور نظریاتی گرفت سے آزاد کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے تاکہ آنے والی نسلوں میں امن و آشتی کا جذبہ اور فکری رَواداری پیدا ہو اور انسانی معاشرہ صحیح معنوں میں انسانی معاشرہ کہلانے کے قابل ہو سکے۔

مَیں کچھ عرصہ نصاب کے صوبائی ادارے سے وابستہ رہا ہوں۔ اِس لیے جانتا ہوں کہ ''نصابی سازی'' کو قومیانے کی روش سے کیا کیا مسائل اور دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اور "National Aims and Objectives" کے نام پر کس کس طرح اپنی کمزوریوں اور غلطیوں پر پردہ ڈالا جاتا ہے اور دوسری قوموں کے کلچر اور فکری روایات کی نفی کی جاتی ہے۔ ''تاریخ اور نصابی کتب'' میں ڈاکٹر مبارک علی نے بجا طور پر اِس کی ذمہ داری نصابی کتب میں تاریخ کے مضمون کو مسخ کرنے والوں پر ڈالی ہے مگر میری رائے میں یہ مسئلہ صرف تاریخی حقائق کو مسخ کرنے یا اُنہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے اور اُن کی اپنے مفاد میں توجیہ کرنے تک محدود نہیں۔ اِس نوع کی کوشش کا دائرہ تمام فکری اور وضاحتی مضامین مثلاً تاریخ، سماجیات، سیاسیات، مدنیت اور اردو تک پھیلا ہوا ہے اور اِس بنیاد پر ان مضامین کے نصاب ایک دوسرے سے کچھ ایسے مماثل ہیں کہ اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے طلبہ جو بدقسمتی سے اِن مضامین کو ایک ساتھ انتخاب کرنے کی حماقت کر بیٹھیں، ان مضامین میں موضوعات کی آپسی تکرار اور فکری مماثلت کے باعث ایک ایسی لامختتم بیزاری کا شکار ہوتے ہیں، جس سے باہر نکل پانا، اُن سے اپنی باقی ساری عمر میں بھی ممکن نہیں ہو پاتا۔ اِس کی بالکل سامنے کی ایک مثال انٹرمیڈیٹ اردو لازمی کا موجودہ نصاب ہے، جس میں تاریخ، مطالعہ پاکستان، جنرل سائنس، علمِ طب اور اسلامیات کا ایسا تڑکا لگا ہے کہ طالب علم اور اُستاد، ہر دو کا دماغ چکرا کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ملغوبہ قومی اور عالمی ہدایات بلکہ مفادات کی روشنی میں وجود میں آیا ہے اور اِس کا مقصد نوجوانوں میں ایک خاص طرح کی فکر پیدا کرنا ہے۔ ایسی فکر جو انہیں ذاتی تعصب سے بالاتر ہو کر سوچنے کے لائق نہ رکھے اور وہ روشن خیالی، خردافروزی اور بے تعصبی کی راہ پر چلنے کے قابل نہ رہیں۔

''تاریخ اور نصابی کتب'' میں ڈاکٹر مبارک علی نے اِس مسئلے پر توجہ کی ہے اور خوب کی ہے۔ اُنہوں نے ہندوستان اور پاکستان میں تاریخ نویسی، تاریخ اور ہندتوا کے نظریے اور ہندوستان و پاکستان میں تاریخ کی نصابی کتب کا تجزیہ کرنے کے علاوہ امریکہ، جاپان، اسرائیل و فلسطین، یوگوسلاویہ کے بحران اور نصابی کتب کا جائزہ بھی لیا ہے اور ''تاریخ اور پوری مرکزیت'' کے نظریے پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ اِس طرح اُن کی کتاب نصابِ تاریخ کا عالمی جائزہ قرار دی جا سکتی ہے اور بلاشبہ یہ کام اِس سطح کا علم اور اِس درجہ روشن دماغ رکھنے والا کوئی نابغہ ہی انجام دے سکتا تھا۔

''تاریخ اور نصابی کتب'' ڈاکٹر مبارک علی کی روشن ضمیری اور خردافروزی کا ثمر ہے۔ اِس کتاب کا دائرہ کار اور دائرہ اثر بہت وسیع ہے اور یہ متنوع اور مختلف النوع معاشروں میں نصابی کتب میں تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں کا احاطہ کرتی ہے۔ تاہم اِس کتاب کا نمایاں پہلو ہندستان میں ہندتوا اور پاکستان میں ''نظریہ پاکستان'' کی سرکاری تفہیم کرنے کی کوشش پر گرفت کرنا ہے۔ جس کے باعث اِس

خطے کی تاریخ کو مسلمان اور ہندو نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔ ایک طرف انتہا پسند ہندو مورخ، ویدک تہذیب کو چار پانچ ہزار سال قبل مسیح تک پیچھے لے کر آریاؤں کو ہندوستان کے اصلی باشندے ثابت کرنے اور ہندوستان کو تمام تہذیبوں کا گہوارہ قرار دینے پر تُلے ہیں تو دوسری طرف پاکستانی مورخ قبل از تقسیم کے ہندوستان کی تہذیب کو اپنا ورثہ قرار دینے سے منکر ہیں۔ دونوں ممالک کی نصابی کتب کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دونوں ممالک کے مورخ، تاریخ کو مسخ کر کے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک ہے اور اِس میں بسنے والے دوسرے مذاہب کے ماننے والے غیر ملکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف ہندو ویدک عہد کو بہت پیچھے تک کھینچ لے جانے پر بضد ہیں تو دوسری طرف مسلمان مورخ ہندوستان پر حملہ کرنے والوں کو اسلام کا حامی، نجات دہندہ اور اُن کی سیاسی جنگوں اور استعمار کو جہاد قرار دے کر تقسیم سے پہلے کے ہندوستان سے اپنی بریّت کا اظہار کرتے ہیں اور اِس کوشش میں یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوستان میں اب تک بسنے والے بیس کروڑ مسلمانوں کو اِس نوع کی فکری روش سے کیا مسائل اور دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ معاشرتی علوم میں تاریخ کا مضمون سب سے زیادہ حساسیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ اسے سرکاری یا قومی نقطۂ نظر سے نصاب کا حصہ بنا کر اُس تعصب اور تنگ نظری کی بنیاد رکھی جاتی ہے جو تا عمر طالب علموں کے وجود کا حصہ بن کر انہیں بے معنی فخر و مباہات اور روز بروز بڑھتی ہوئی نفرت کے ساتھ جینے پر مجبور کرتے ہیں اور وہ دنیا کو وسیع تناظر میں دیکھنے کے قابل نہیں رہتے۔

''تاریخ اور نصابی کتب'' میں ڈاکٹر مبارک علی نے تحقیق اور دقت نظری کے ساتھ اس مسئلے کا تجزیہ کیا ہے اور اِس امر کا احساس دِلایا ہے کہ واقعات کبھی ٹھہرے ہوئے اور جامد نہیں ہوتے۔ اِس لیے زمانۂ حال کی روشنی میں تاریخ کے نقطۂ نظر کو بار بار بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو مورخ کو نصابی کتب میں ماضی کے واقعات کو صرف سَن وار لکھ کر مطمئن نہیں ہو رہنا چاہیے بلکہ اُن کا روشن ضمیری سے تجزیہ کر کے خردافروزی کی روایت فروغ دینا چاہیے تاکہ ہماری دنیا بے سود منافرت اور لایعنی افتخار کے بوجھ سے دبی نہ رہے۔

''تاریخ اور نصابی کتب'' میں ڈاکٹر مبارک علی نے کسی طرح کی جذباتیت سے کام نہیں لیا۔ خردافروزی کی تحریک کا ایک اہم نام ہونے کے باعث ان سے اِسی نوع کی حقیقت نگاری، بے تعصبی اور روشن خیالی کی توقع تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ ایک بے ریا، روشن ضمیر اور صاحب الرائے تاریخ داں ہیں اور تاریخ کے مضمون میں رَوا رکھے گئے گھپلوں کا بھرپور تجزیہ کرنے اور اُن کا محاکمہ کرنے کے اہل بھی کہ جس کا ثبوت ان کی اب تک شائع ہونے والی سبھی کتابیں ہیں۔ سو مَیں انہیں ایک ہزار برس تک سلامت رہنے کی دعا دیتا ہوں مگر خود کو حقائق تک محدود رکھنے کی خاطر میں ہر برس کے دن پچاس ہزار نہیں تین سو پینسٹھ ہی شمار کروں گا۔

☆☆☆

ابن حسن

جمالیات (۱۰)

ادب اور معروضی حقیقت

احمد ندیم تونسوی

غبارہ موومنٹ

''ڈِکٹیٹر شپ کا جب تک ذاتی تجربہ نہ ہو۔ یہ سمجھ میں آنے والی چیز نہیں۔ اب جب کہ تمہیں ذاتی طور پر کچھ نہ کچھ تجربہ ہو گیا ہے اور مزید تجربہ دو تین دن میں ہو جائے گا تو اُمید یہی ہے کہ تم بھی میری طرح سینہ ٹھونک کر کہہ سکو گے کہ ہاں! مجھے ڈِکٹیٹر شپ کا ذاتی تجربہ ہے۔'' صحافی کا انداز برابر خطیبانہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب کہ مجھے نیند آئی جا رہی تھی۔ مجھے ٹینشن میں نیند آ جاتی ہے۔

تنہائی کے خوف کے سبب مجھے یہ اُجڑا ہوا، لیکن پُر جوش صحافی پہلے نعمت لگا پھر غنیمت، پھر فالتو اور اَب مصیبت لگ رہا تھا۔ جن لوگوں کا کسی باتونی صحافی سے کبھی واسطہ پڑا ہو کچھ وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسا صحافی آپ کی گھریلو پریشانیوں میں کتنے اور کیسے شوخ رنگ بھر سکتا ہے۔ ایک صحافی پھر باتونی، آپ کی ازدواجی پریشانیوں کو عالمی سیاسی مسائل سے کچھ اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ پھر آپ کو اپنے مسائل بالکل ہی لطیفے لگتے ہیں، لیکن رہتے اپنی جگہ پر ہیں۔

صحافی نے اپنی آمد سے یعنی شام سے آدھی رات تک مجھے ڈِکٹیٹر شپ کے اسباب، واقعات، نتائج اور ممکنہ اثرات اَز بَر کرا دیئے تھے کہ میرے جیسا قطعی غیر سیاسی بندہ اور گھریلو شوہر بھی دس پندرہ منٹ تک لوگوں کو ششدر کر سکتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ڈِکٹیٹر شپ کیا ہوتی ہے۔

مجھے ڈِکٹیٹر شپ کی فضا میں سانس لیتے ہوئے بمشکل بارہ گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ آخر ڈِکٹیٹر شپ ہوتی کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ جان گیا بلکہ اَب تو عملی مظاہرے کا حصہ بھی بن گیا ہوں۔ ڈِکٹیٹر شپ کے مسائل و اہداف پر صحافی مذکور کے توسیعی لیکچر سے جو کچھ میں اَز بَر کر سکا وہ کچھ یوں ہے کہ ڈکٹیٹر شپ کا پہلا اور آخری وار آزادیٔ اظہار کے تمام مسلمہ طریقوں پر ہوتا ہے۔ پبلک کو کسی بھی قسم کے اظہار کی آزادی سے روک دیا جاتا ہے۔ عوام الناس کو اچھے شہری کے آداب سکھائے جاتے ہیں کہ یوں مجمع لگانے اور گلا پھاڑ پھاڑ کے حکومت کے خلاف بولنے سے سماجی بہبود کے منصوبوں کا حرج ہوتا ہے۔ اگر پھر بھی یہ بولتی اقلیت خاموش اکثریت کو ڈسٹرب کرے تو ظاہر ہے ایسے میں سماج دشمن اقلیت کو روکنا ڈِکٹیٹر شپ کا فرضِ واحد بن جاتا ہے۔ بلکہ صحافی نے قلیل اقلیت کہا تھا کہ سرکاری میڈیا یہی کہتا ہے۔ جب ڈِکٹیٹر شپ طول پکڑتی ہے جو کہ عموماً پکڑ ہی لیتی ہے تو ریاست کے شہری تھک ہار کے سوچنے اور بولنے کی پابندی قبول کر کے کچھ عرصہ ستانے کے لیے وقفہ کرتے ہیں اور حکومت سمجھتی ہے کہ لوگ عادی ہو گئے ہیں۔ تو ایسے ہی بھی احتجاج کا کوئی نہ کوئی رستہ نکلتا رہتا ہے۔ لمبی لمبی تقریروں، جذباتی نعروں اور ٹائر جلانے سے ہوتی ہوئی احتجاجی تحریک تشدد تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر تحریری احتجاج شروع ہوتا ہے۔ دیواروں پر حکومت وقت کو

للکارا جاتا ہے اور آسان لفظوں میں طرزِ حکومت درست کرنے کی تجاویز بھی لکھی جاتی ہیں۔ پھر پوسٹر پمفلٹ کا میڈیم اپنایا جاتا ہے۔ حکومتی اداروں کے تشدد کے بعد یہ بھی مدھم پڑ جاتے ہیں۔

جس ملک کے دارالحکومت کے ایک پولیس اسٹیشن کی ایک سڑا ندی بیرک میں مَیں پچھلے بارہ گھنٹے سے بند تھا، اُس ملک کے شہریوں نے ڈِکٹیٹر شپ کے خلاف ایک نئی طرح کا احتجاج شروع کر رکھا تھا اور اِس نئی طرز کے احتجاج کے اثرات براہِ راست مجھ پر بھی پڑے۔ اسے کہتے ہیں عالمی حالاتِ حاضرہ سے لاعلم رہنے کا خمیازہ بھگتنا۔

☆☆☆

مجھ ایسے یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے، بالکل چھڑے چھانٹ، بے روزگار، مایوس اور کاہلی کی طرف مائل نوجوان کے لیے یہ ایک فوری اور بہتر راستہ تھا کہ خودی کہ قیمت پر کچھ دن مزے کے گزار لیے جائیں تو قطعاً گھاٹے کا سودا نہیں اور جب پیٹ بھرا ہوا ہو اور گرم و گداز بستر میسر ہو تو پرواز کرنے کو کس کا جی چاہتا ہے اور پھر پرواز میں کوتاہی کے کیا معنی۔

ایم۔اے کے رزلٹ کے چند مہینوں کے بعد ایک انٹیریئر ڈیکوریشن فرم میں بطور اکاؤنٹنٹ ملازمت کی لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ جاب جیسی کسی بھی سرگرمی کے لیے اپنی طبیعت موزوں نہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح تین ماہ گزار لیے تاوقتیکہ اِسی تنخواہ پر مجھے شوہر رکھ لیا گیا۔ جب فرم کی فربہ مالکہ (جو اَب تک کی میری واحد بیوی ہے) نے مجھے اپنے حلقہ ازدواج میں لانے کی پیشکش کی تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ میں کیا سُن رہا ہوں۔ گھر داماد والے معاملے میں ساس سُسر سے معاملات طے کیے جاتے ہیں، جبکہ گھر شوہر والے معاہدے میں براہِ راست دوسرا فریق یعنی ممکنہ بیوی ہوتی ہے۔ یوں میں گھر شوہر بن گیا۔ میری اور میری بیوی کی عمروں میں بیس سال کا فرق ہے۔ یہ میری پہلی اور میری بیوی کی تیسری شادی ہے۔ اِس سے آپ اُس کے ازدواجی تجربات کی ہمہ جہتی کا اندازہ لگا سکتے ہیں، ہم میاں بیوی، بلکہ بیوی میاں کہنا مناسب رہے گا، کے درمیان اَب بھی وہی آجر اَجیر کا تعلق ہی بنیادی تعلق ہے صرف جگہ کی تبدیلی ہوئی یعنی شوروم کی بجائے گھر پہ ڈیوٹی لگا دی گئی اور شوہرانہ وظائف و فرائض بغیر کسی محنتانے کے۔ ہاں البتہ یہ ہوا کہ اِس نئے معاہدے سے کھڑے کھڑے ملازمت سے دھتکار دیئے جانے والا خدشہ کم ہو گیا۔ لیکن ختم نہیں ہوا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہونے کے باوجود مجھے اُس کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں اپنے تئیں خود کو اِس لحاظ سے خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ میں واحد مرد ہوں جو فی میل شاونزم کا براہِ راست اور رضا کارانہ شکار ہے۔ بیٹھے بٹھائے ایک تجربہ کار، پیسے والی بیوی کا شوہر بننے کی یہی مناسب قیمت ہو سکتی ہے۔ یہی سوچ کر تسّو یہ کر لیا اور ویسے بھی جس معاہدے میں ہر فریق یہ سمجھے کہ دوسرا فریق نقصان میں ہے، اُس سے بہتر اور مضبوط معاہدہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔

آسودگی، تن آسانی، آلکس، نکما پن، کاہلی اور سُستی پڑھے لکھوں کو عموماً اخباری معمے حل

کرنے کی طرف لے جاتی ہے۔ اِس سے ذہنی مصروفیت کے ساتھ ساتھ کچھ غیبی مالی امداد کے لالچ کا ہاتھ بھی ہوتا ہے۔ لیکن بخدا میں صرف اور صرف دافع وقتی کے لیے اخباری معمے حل کرتا ہوں اور بلا تفریق غیر انعامی اور انعامی معمے حل کرتا ہوں۔ اَب ایسا بھی نہیں کہ کبھی کوئی تحفہ یا نقد رقم مل جائے تو برا محسوس ہو۔ پچھلے ہفتے ایسے ہی ایک انعامی معمے کے سلسلے میں بیرون ملک (بلکہ ہمسایہ ملک) آنے جانے اور ہوٹل میں قیام کے انعام کی اطلاع ملی تو طبیعت میں شگوفے پھوٹ نکلے۔ اپنے/ اپنےنصف بہتر سے خوشی چھپاتے ہوئے بظاہر سپاٹ لہجے میں ذکر کیا تو اُس کا ردِعمل میرے خیال کردہ ردِعمل سے بالکل ہی اُلٹ نکلا۔ پہلے تو اپنی بے وقعتی کے احساس سے خود کو بے وزن محسوس کیا لیکن پھر اپنا وزن مجتمع کیا کہ حواس اور صورتِ حال کو قابو میں رکھنا اَز حد ضروری تھا۔ بیوی نے کھلے دل سے اجازت دے دی۔ لیکن کسی بھی قسم کی مالی اِمداد سے بالکل ہی انکار کر دیا اور بیرون ملک اکٹھے سیر کرنے کی میری تجویز کو میری خواہش کے عین مطابق حقارت سے ردّ کر دیا گیا۔ رختِ سفر بھی مجبوری/ضروری والے ایکسپریشن میں باندھا۔

اِس بیگانے ملک کے دارالحکومت میں میری دلچسپی کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں تو بس آزادی سمجھنے کے لیے آیا تھا۔ سینما، تھیٹر، پارک، شاپنگ پلازے، میوزیم، سپورٹس اِن چیزوں سے مَیں ویسے ہی دُور بھاگتا ہوں۔ ہوٹل سے نکلا تو شام ہو چکی تھی۔ کھلی فضا میں سانس لیا تو آزادی کے احساس سے دنیا مزید خوبصورت دِکھنے لگی۔ یونہی دماغ میں ایک کوندا سا لپکا تو میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکلا۔ ویران فٹ پاتھ پر سامنے سے آتے ہوئے ایک بوڑھے نے مسکرا کے میری جانب دیکھا اور دوستانہ انداز میں ہاتھ لہرایا۔ مَیں نے بھی جواباً خوشدلی سے ہاتھ لہرایا۔ ''لیکن پہلے احتیاط'' میں نے ایسے کہا جیسے بوڑھے کو کہہ رہا ہوں۔ تب مَیں تیز ترنگ میں سیٹی بجاتا سامنے ڈیپارٹمنٹل سٹور کی طرف چل دیا۔

میں ڈیپارٹمنٹل سٹور میں اپنی مطلوبہ چیز ابھی تلاش کر رہا ہی تھا کہ ایک اٹنڈنٹ میری طرف آیا کہ میری مطلوبہ چیز تلاش کرنے میں مدد کر سکے۔ اُس کے پوچھنے پر ابھی میرے منہ سے ''کنڈو۔۔'' ہی نکلا تھا کہ فوراً اُس کے کھردرے ہاتھ نے میرا منہ یوں سختی سے بند کیا کہ مِیم کی آواز میری ناک سے بمشکل برآمد ہوئی۔ شکر ہے اُس وقت ڈیپارٹمنٹل سٹور کا یہ حصہ ویران پڑا تھا، لوگ نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ مجھے تقریباً گھسیٹتا ہوا ایک طرف چھوٹے سے کیبن میں لے گیا۔ جتنی دیر میں میرے حواس سنبھلتے سٹور کا منیجر بھی آ گیا۔ جب میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو میں نے منیجر سے پوچھا کہ 'کیا بات ہے۔ آپ لوگ غصے میں کیوں ہیں۔'

''تم کنڈوم کس مقصد کے لیے خریدنا چاہتے ہو؟'' منیجر نے لہجہ شائستہ بناتے ہوئے پوچھا۔ اِس سوال کا جواب دینے کی ہمت وہی کر سکتا ہے جس نے کبھی یہ سوچا ہو کہ اُس سے یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے لبِ اظہار پہ تالے تو لگنے ہی تھے۔

''ابھی پولیس آتی ہوگی۔ وہی تم سے پوچھے گی۔'' وہ شاید پولیس کو بھی اطلاع کر چکے تھے کہ

پولیس فوراً ہی آ پہنچی لیکن پولیس سٹیشن پہنچتے پہنچتے اور پھر بیرک میں ڈال دیے جانے کے بعد بھی مجھے کچھ سمجھ نہیں نہ آیا کہ کنڈوم خریدنا جُرم کب سے ہو گیا۔

مجھے پولیس سٹیشن میں ایک خالی بیرک میں ڈال دیا گیا کہ میں سوچ لوں، کیا کہنا ہے اور کچھ دیر میں انٹیلیجنس والے بھی پہنچنے والے ہیں۔ گھنٹہ سوا گھنٹے کے بعد وہ بھی آ گئے اور آتے ہی اُنہوں نے وہی سوال کیا کہ میں کنڈوم کیوں خریدنا چاہتا تھا۔ مجھے ہنسی آ گئی کہ اَب یہ بھی ایجنسیوں کی ذمہ داری ہوگئی کہ کوئی کیوں کنڈوم خریدنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے وہی جواب دیا جو دینا چاہیے تھا۔ وہ مجھے رات کی مہلت دیتے ہوئے چلے گئے کہ کل تک مزید سوچ لوں اور میں حیران و پریشان کہ بتا تو دیا ہے اور کیا بتاؤں؟ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ یا خدا! میں نے کونسا ایسا جرم کیا ہے کہ غیر ملک میں آزادی کی پہلی نرم و گداز رات کا تصور لیے ہوئے مَیں اِسی ملک کے ایک پولیس اسٹیشن کی ایک بدبودار بیرک میں بند کر دیا گیا ہوں۔ اَب سردی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ بیرک کی دیواریں اور فرش بالکل یخ ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک کانسٹیبل نے کالا کمبل یہ کہتے ہوئے پھینکا کہ اُس کے ملک کے لوگ غیر ملکیوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ورنہ یہاں کمبل نہیں ملتا۔ میں نے وہ غلیظ کمبل اُوڑھا تو نہیں البتہ اُس کو فرش پر بچھا کے اوپر بیٹھ گیا کہ کم از کم پینڈا تو گرم رہے۔ دیوار سے ٹیک لگائے مجھے اُونگھ آ گئی۔ مَیں نے کہا ہے ناں کہ مجھے ٹینشن میں نیند آ جاتی ہے۔

بیرک کا جنگلہ بجنے کی آواز آئی تو میری آنکھیں کھلیں۔ کانسٹیبل نے تقریباً دھکا دیتے ہوئے ایک سفید پوش شخص کو میری بیرک میں دھکیل دیا اور نوارد نے یہ کہتے ہوئے احتجاج کیا کہ پولیس والوں کو شریف لوگوں سے چوراُچکوں جیسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔

سفید پوش قیدی میرے قریب آ کے بیٹھ گیا پھر خود ہی شروع ہو گیا۔ 'چندا لینا بھی اَب جرم بن گیا ہے۔ کمال ہے۔ اندھیر نگری ہے اور کیا۔ ابھی ضمانت ہو جائے گی۔ دیکھتا ہوں مجھے یہاں رات تک کون روک سکتا ہے۔' پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا 'شکل سے جیب کترے دِکھتے ہو۔ جیب کاٹتے پکڑے گئے ہو گے۔ انسان کو اچھے کام کرنے چاہئیں۔ انسان کو جو اعضاء عطا کیے گئے ہیں۔ اُن سے انسان اچھے کام لے، ورنہ یہی اعضا انسان کی ذلت و رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔ جیسا کہ تمہارے ساتھ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں نے کیا ہے۔' یہ صاحب سماجی بنیاد پرست معلوم پڑتے تھے اور انسان کو فرشتہ بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔ اُن کا لہجہ اُن کے یقین کی پختگی کا ثبوت تھا۔ چہرے کے تاثرات اور لہجے کے اعتماد سے یوں لگتا تھا جیسے اُنہوں نے اپنی ساری زندگی 'اپنے ہی سنہری اُصول کے خوف کے سبب' اپنے اعضاء کو اچھے کام کرنے پر مجبور کرنے میں صرف کر دی ہو۔ وہ صاحب بولتے رہے اور میں سب کچھ چپکا سُنا کیا۔ اُنہوں نے مجھے جیب کُترا بنا دیا اور مجھے بولنے کا موقع بھی نہ دیا۔

اُن کی بات سچ ثابت ہوئی۔ بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا کہ اُن کے لینے والے آ گئے۔ جاتے جاتے اُنہوں نے مجھے کامیاب زندگی گزارنے کا سنہری اُصول بتایا کہ 'جسم کا جو عُضو' بذاتِ خود انسان

کے لیے ذلت ورسوائی کا باعث بنے اُسے جسم سے الگ کر دینا چاہیے۔' لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیسے؟

اُن صاحب کے جانے کے بعد بیرک کا سڑا ندہ سا مختصر ماحول بجھ گیا جیسے پھلجھڑی کی چکا چوند کے بعد اندھیرا مزید گہرا ہو جاتا ہے۔ رات جھوم چلی تھی کہ ایک اور مہمان لائے گئے۔ اُن کی آمد سے یوں معلوم ہوا جیسے وہ محض معائنہ کرنے آئے ہیں اور بس۔ وہ صاحب دونوں کانسٹیبلوں سے ہنس ہنس کے باتیں کرتے ہوئے میری بیرک میں داخل ہوئے۔ یہ وہی دُبلا پتلا سڑیل سا باتونی صحافی تھا جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اُس کے جسم کی سب سے قابلِ ذکر چیز اُس کی طوطے جیسی گول گول چمکدار آنکھیں تھیں جن میں عجیب سی جھلک تھی۔ جس کو وہ خود ذہانت کی تحریر کہتا تھا۔

☆☆☆

اپنے ملک سے دُور کسی اور ملک کے کسی پولیس سٹیشن کی ایک بیرک میں گزرنے والی میری پہلی رات اَب آدھی بیت چلی تھی لیکن صحافی مسلسل بولے جا رہا تھا۔ سگریٹ کا کوٹہ اُس نے منگوالیا تھا ایک دو سگریٹ میں نے بھی کھینچے۔ صحافی نے عادتاً تین چار طویل کش، مٹھی میں سگریٹ بھینچ کے لگائے تو کچھ دیر تک اُس کا چہرہ دھویں کے پیچھے چھپ گیا۔ پھر ایک ہلکا سا ملائم سا کش لگایا جیسے سگریٹ کو سہلا رہا ہو۔ چٹکی بجا کے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ اِس کا مطلب تھا کہ وہ اَب ایک اور نان سٹاپ خطبہ شروع کرنے والا ہے۔

'جب وال چاکنگ، پوسٹر، پمفلٹ، ہینڈ بل پر سختی سے کنٹرول کر لیا گیا تو پبلک کے پاس کوئی بھی راستہ نہ رہا۔ ایک سال تک کسی بھی قسم کے احتجاج کی کہیں سے بھی کوئی اطلاع نہ ملی اور یہ اِس دور کا تیسرا سال تھا۔ اَب اس دور کا گیارہواں سال بھی ختم ہونے والا ہے۔ تو اِس دور کا تیسرا سال تھا جب، ایک دن اچانک یوں ہوا کہ دارالحکومت کے مرکزی چوک پر غباروں سے بندھا ہوا خاصا بڑا بینر یوں اُترا جیسے پیراشوٹ سے کوئی چھاتہ بردار اُترتا ہے۔ ٹریفک رُک گئی، لوگ جمع ہوتے گئے کہ وہ بھی پڑھیں۔ بینر پر کیا لکھا ہے۔ بینر پر احتجاجی نعرے لکھے تھے اور بعض حکومتی لوگوں کے ناموں کے ساتھ مختلف جانوروں کے نام جوڑے گئے تھے۔ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ پھر ٹھٹھے لگنا شروع ہو گئے۔ معاملہ پولیس کے ہاتھ سے نکلتا محسوس ہوا تو ایسے موقعوں سے نمٹنے کے لیے مختص سپیشل فورس کو بلایا گیا تب کہیں جا کے پبلک کا ہجوم چھٹا اور ٹریفک بحال ہو سکی۔ سنسر کی سختی کی وجہ سے یہ واقعہ یہاں تو دَب گیا لیکن سینہ بہ سینہ پورے ملک میں پہنچ گیا کہ دارالحکومت میں ہونے والا ہر واقعہ اہم ہوتا ہے۔'

صحافی بول رہا تھا اور مجھے نیند آئی جا رہی تھی۔

'پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ ملک کے اُن تمام چھوٹے بڑے شہروں میں جہاں جہاں ہوا میں اُڑنے والے غبارے دستیاب ہو سکتے تھے۔ اِس قسم کے احتجاجی بینر غباروں کے ساتھ باندھ کر فضا

میں چھوڑ دینے کا رواج پڑ گیا۔ احتجاج کا طریقہ ایسا محفوظ، آسان اور تیر بہدف تھا کہ ہفتوں ہی میں پورے ملک میں رائج ہو گیا۔ لوگ اپنی پسند کے احتجاجی نعرے کپڑے اور مومی کاغذوں پر لکھتے اور اُنہیں اُڑنے والے غباروں سے باندھ کر آزاد فضا میں چھوڑ دیتے۔ پبلک میں اس طرز احتجاج کی مقبولیت کی رفتار ایسی تیز ہوئی کہ ملک کے طول وعرض میں چھوٹا بڑا ایسا کوئی شہر نہ ہوگا جس کے اوپر کسی وقت احتجاجی بینر بردار غبارے موجود نہ ہوں۔ دارالحکومت سمیت تمام بڑے شہروں میں تو دن کے وقت آسمان پر انہیں احتجاجی بینر بردار رنگ برنگے غباروں کا چمن سا کِھلا ہوتا۔ ریاستی دہشت کے ادارے باؤلا گئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ غباروں سے متعلق کاروبار والوں کی چاندی ہوتی گئی۔ مال کی کھپت اور مانگ کے اُصول پر غباروں کی مانگ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ غبارے اب بچوں کے ہاتھوں سے نکل کر بڑوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکے تھے اور حکومت کے لیے یہی ایک مسئلہ رہ گیا تھا کہ اس احتجاج کو کیسے روکا جائے۔ سچی جھوٹی گرفتاریاں بھی دھڑا دھڑ ہوتی رہتیں لیکن احتجاج کسی طرح سے آہستہ نہ ہوا، ختم ہونا تو دُور کی بات۔ پھر کسی بڑے حکومتی عہدے دار کی عقل میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ غباروں پر پابندی ہی لگا دی جائے۔ سو غباروں کی خرید وفروخت اور ملکیت پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی لیکن غباروں کی بلیک مارکیٹ میں خرید وفروخت کے کاروبار اور سٹاک کے تبادلے نے زور پکڑا۔ کچھ اعلیٰ حکومتی عہدیداروں نے بھی اِس کاروبار سے الغارُوں کمایا۔ ایک ہمسایہ ملک کی غباروں کی صنعت پہلے چمکی پھر تو چکا چوند ہو گئی۔ یہ ملک 'کہ ایک غریب اور بدطینت ہمسایہ ہے اُس نے سرکاری سطح پر اِس ملک میں غباروں کی سمگلنگ کی سرپرستی کی۔ پھر کیا تھا سمگلروں کو ایک نیا کاروبار مل گیا اِدھر سے گھی جاتا اُدھر سے غبارے آتے۔ اِدھر سے گندم جاتی اُدھر سے غبارے آتے۔ اِدھر سے وہسکی جاتی اُدھر سے غبارے آتے۔ اِدھر سے کپڑا اور چینی جاتے اُدھر سے غبارے آ جاتے۔ سیاسی پارٹیوں کے ورکر احتجاج کا ٹیمپو تیز رکھنے کے لیے اور آسودہ حال طبقہ اپنی نجی تقریبات سجانے کے لیے غبارے بلیک میں خریدتے اسی طرح گیس سلنڈروں کا کاروبار کرنے والوں نے پابندیوں کا توڑ ڈھونڈ نکالا۔ غرض یہ کہ احتجاج بڑھتا گیا جوں جوں روکا گیا۔ حکومت کی سخت پالیسی کے سبب کچھ مہینوں تک غباروں کی ناجائز ترسیل مکمل طور پر رُک گئی پھر پتنگوں کے آف سیزن کی طرح بینر بردار رنگین غباروں کے اِکا دُکا جھنڈ ہوا کی لہروں پر تیرتے دِکھائی دیتے تو وہ کثیر آبادی حسرت سے اِنہیں دیکھتی جن کے پاس یہ غبارے نہ ہوتے۔ بظاہر احتجاج کا یہ طریقہ بھی دَم توڑتا دِکھائی دے رہا تھا کہ لوگوں نے مانع حمل غبارے احتجاج میں شامل کر لیے۔ یہ غبارے بے رنگ ہوتے ہیں جب کہ لوگوں کو رنگین آسمان دیکھنے کی عادت پڑ چکی تھی اس لیے اَب لوگوں نے معاملہ اُلٹ کر دیا یعنی اَب بے رنگ غباروں کے ساتھ رنگین بینر باندھنے کا رواج پڑ گیا۔ یہ اپنی ساخت کے باعث بھاری بینر لے کر فضا میں دُور تک اُڑ سکتے تھے۔ ہوا کے دوش پر سوار احتجاجی نعروں سے مزین بینر اپنے ساتھ لٹکائے یہ غبارے اکثر اردگرد کے ہمسایہ ملکوں میں جا نکلتے۔ وہاں سے عالمی میڈیا اُنہیں اُچک کر پوری دنیا میں پھیلا دیتا جو

حکومت کے لیے عالمی طور پر ہیٹی کا باعث بنتے۔ بینر بردار غباروں کو سرحد پار جانے سے روکنے کے لیے حکومت نے سرحدوں پر شوٹرز کی ڈیوٹی لگا دی کہ کوئی بینر سرحد پار نہ کرنے پائے۔ اگلے ہی ہفتے ایک ہمسایہ ملک نے رابطہ کیا کہ جنگ کا موڈ ہے یا ویسے ہی مسخری کر رہے ہو۔ اس کے بعد سرحدوں سے شوٹرز ہٹا لیے گئے لیکن شہروں میں شوٹر بڑھا دیئے کہ غباروں کو اُڑتے ہی پھٹا دیا جائے تاکہ راستہ نہ بھٹکیں۔'

''شوٹرز تو ائر پورٹوں پر نہیں ہوتے؟ جو پرندوں کو مارتے ہیں تاکہ جہازوں نہ سے ٹکرائیں۔'' میں نے اونگھتے ہوئے پوچھا۔

''غبارے مارنے والوں کو اِدھر سِول شُوٹرز کہتے ہیں۔ تو یہ سِول شوٹرز دُور مار والی سپیشل ائیر گنیں لیے شہروں میں ہر وقت گھومتے رہتے۔ جب بھی کوئی بینر بردار غبارے نظر آتے سِول شوٹرز غبارے پھٹاتے اور بینر کو بحقِ سرکار ضبط کر لیتے لیکن اس سے بھی خاطر خواہ نتائج نہ نکلے۔''

'بعض اوقات تو یوں ہوتا کہ غبارے پھٹنے کے بعد بینر درختوں، کھمبوں یا اونچی عمارتوں میں اٹک جاتے اور سرکاری اہل کاروں کے لیے کام پیچیدہ بنا دیتے اور جب تک بینر نہ اُترتا ایک تماشا سا لگا رہتا۔ جو بجائے غبارہ موومنٹ کو دبانے کے مزید شہرت کا باعث بنتا۔'

''یہ نام ___ میرا مطلب ہے غبارہ موومنٹ ___ آفیشل نام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پبلک نے یہ نام دیا ہے اور یہی نام چل پڑا۔ اَب ہر کہیں غبارہ موومنٹ لکھا پڑھا اور سمجھا جاتا ہے۔ البتہ سرکاری میڈیا اس تحریک کا نام اپنانے کو تیار نہیں۔ لیکن کب تک؟''

''پبلک بھی کیسے کیسے مذاق کرتی ہے؟'' میں نے کہا۔

''مذاق کرنا بھی اسے آتا ہے جس سے مذاق ہوا ہو۔'' صحافی نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

رات سرک سرک کر گزر رہی تھی۔ سردی نے نیند کو بھگا دیا تھا۔ صحافی مزے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا اور مجھے غبارہ موومنٹ کے بارے میں بنیادی معلومات دے رہا تھا۔

'گزشتہ بجٹ سے کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ بہت سے رنگین غباروں سے بندھا ہوا جہازی سائز کا ایک بینر کہیں سے اُڑتا ہوا آ گیا۔ ظاہر ہے سول شوٹرز تعاقب میں تھے۔ غبارے کم ہونے پر بینر کچھ نیچے تو آ گیا مگر سٹیٹ بنک کی بلڈنگ پر یوں جامع طریقے سے چسپاں ہو گیا جیسے حکومت نے خود باقاعدہ اہتمام کے ساتھ لگایا ہو۔ اس پر لکھا ہوا عوامی مطالبہ دُور سے پڑھا جاتا تھا۔ 'غباروں سے پابندی اُٹھاؤ'۔ بینر کچھ زیادہ ہی سخت جان نکلا۔ بینر ساتویں آٹھویں منزل پر اٹکا ہو گا لہٰذا کارندوں کا کام پیچیدہ تر ہو گیا اور سارا شہر دیکھنے کو پلٹ پڑا۔ ہجوم کو کنٹرول کرنا اور بینر اُتارنا بہت مشکل کام ہو گیا۔ آنسو گیس سے ہجوم کو منتشر کرنا پڑا۔ اسی لٹکتے بینر کی تصویر ٹائم کے سرورق پر شائع ہوئی اور یوں یہ جہازی سائز کا بینر تاریخ کا حصہ بن گیا۔'

'حالات یہاں آن پہنچے ہیں کہ حکومت نے اپنا سارا زور غبارہ موومنٹ کو دبانے کے لیے لگایا ہوا ہے اور پبلک نے احتجاج بردار غباروں پر ہی قناعت کر لی ہے۔ روز کوئی نہ کوئی تماشا لگا رہتا ہے۔ بار بار کی ڈکٹیٹر شپ بھی مذاق بن جاتی ہے۔ غبارہ موومنٹ کے پہلے ہی سال مانع حمل غباروں پر بھی سخت پابندی لگا دی گئی تو اگلے ہی تین سالوں میں شرح پیدائش میں اتنا اضافہ ہوا کہ پھر اقوام متحدہ کے دباؤ پر مانع حمل غباروں سے پابندی تو ہٹا لی گئی لیکن مانع حمل غباروں کے حصول کے لیے ضرورت مندوں اور حق داروں کی آسانی کے لیے پرمٹ سسٹم متعارف کرایا گیا تاکہ شہری معاشرے کا بھرم قائم رہے۔ یہ شہری معاشرہ تو میں نے تمہاری آسانی کے لیے کہا ہے ورنہ اِدھر سِول سوسائٹی چلتا ہے۔'

''تو کیا کوئی معاشرہ جنگلی بھی ہوتا ہے؟'' میں نے واقعی سوال کر دیا۔

''معلوم نہیں لیکن اِدھر سِول سوسائٹی ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ ڈِکٹیٹر شپ میں سِول سوسائٹی'' صحافی نے سِول قہقہہ لگایا یعنی دھیمے دھیمے۔

صحافی نے پیکٹ میں سے دو سگریٹ منتخب کیے اُنہیں ہونٹوں میں دبایا، لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ ہونٹوں سے سگریٹ نکال لیے۔

''لیکن مانع حمل غباروں کے کوٹہ سسٹم سے بھی حکومت کی منشا کے مطابق نتائج برآمد نہ ہوئے۔ ایک تو یہ کہ غبارہ موومنٹ نے مزید زور پکڑا کہ سرکاری اہل کار بلیک میں بیچ دیتے تھے جن میں زیادہ تر خریدار سیاسی کارکن ہوتے اور دوسرا یہ کہ جو غریب لوگ پرمٹ پر کنٹرول ریٹ پر کنڈوم خریدتے وہ بہتر منافع پر بیچ دیتے اور خود بغیر کنڈوم کے ہی گزارا کر لیتے کہ بُرے حالات سے تسویہ کرنا بعض اوقات مجبوری بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ موومنٹ رُکی اور نہ آبادی ___ زِچ ہو کر حکومت کو مانع حمل غباروں پر بھی سختی سے پابندی لگا دینی پڑی۔ غریب آبادی جو کہ اِس ملک کی کل آبادی کا آدھے سے بھی زیادہ ہے وہ بلیک مارکیٹ کا مہنگا کنڈوم افورڈ نہیں کر سکتی اور جو خوش حال طبقے کے لوگ ہیں وہ اپنی ضرورت کے مطابق کسٹم حکام کی ملی بھگت سے کنڈوم باہر سے لاتے ہیں۔ پیسے کے آگے کس کا زور چلا ہے۔ غریب ہر دَور میں پستا رہا ہے حالانکہ ریاست کے لیے بنیادی سرمایہ پرولتاری کلاس پیدا کرتی ہے اور بورژوا.....'' صحافی کا لہجہ مارکسی ہوتے ہوتے رہ گیا۔ تھوڑی دیر سوچا کیا پھر چپ ہو گیا۔

صحافی نے سردی محسوس کرنے کے لیے وقفہ کیا اور اکٹھے دو سگریٹ سُلگائے، ایک مجھے دیا، پھر اُس نے حسبِ عادت مٹھی بھینچ کے تین چار مسلسل کش لگائے اور مجھے بھی مشورہ دیا کہ اس طرح کش لگانے سے دماغ بہتر کام کرتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی سے کش لگانے کے بعد پھر شروع ہو گیا اور میں اب توجہ سے سُن رہا تھا کہ صحافی باتیں بڑی دلچسپ اور لبھانے والے انداز میں کرتا تھا۔

''ہمہ قسم کے غباروں پر پابندی کے باعث ملک کی آبادی محتاط اندازے سے دوگنی بلکہ کسی سال تو تگنی شرح سے بڑھ رہی ہے۔ غبارہ موومنٹ آج کل بہت زوروں پر ہے موسم اچھا ہے اور لوگوں کو

سالانہ چھٹیاں بھی ہیں سو لطف کا لطف اور احتجاج کا احتجاج.....''

میں نے ایک کپکپاتی انگڑائی لی جسے صحافی نے اپنی توہین سمجھا اور اپنا ہی قطع کلام کرتے ہوئے مجھے کہا کہ اگر ایسی صورتِ حال میں سردی لگ رہی ہو تو پانچ منٹ تک دیوار کے سہارے سر کے بل اُلٹا کھڑا ہونے سے سردی اثر نہیں دکھاتی اور تم لاغر اور مدقوق جو دِکھتے ہو تو اِس کی محض وجہ ہی یہی ہے کہ تم جسمانی کسرت سے خوف زدہ دکھائی دیتے ہو اور لاغر آدمیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ چاپلوس اور سازشی ہوتے ہیں اور.....'' میں نے خاصی اونچی آواز میں صحافی پر لعنت بھیجی اور ایک طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔

اگلا دن بھی یونہی گزر گیا۔ سارا دن عجیب سی بے کلی اور پریشانی نے گھیرے رکھا۔ کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں تھی، پولیس اسٹیشن میں جو مل جائے غنیمت لگتا ہے۔ شام ہونے سے ذرا پہلے مجھے مطلع کیا گیا کہ پرسوں مجھے عدالت لے جایا جائے گا جہاں اُسی وقت عدالت فیصلہ سنا دے گی اور یہ کہ میری بیوی کو میری گرفتاری اور اُس کی وجہ سے بھی مطلع کر دیا گیا ہے اور وہ اُس دن عدالت ہی میں موجود ہوگی اور یہ میری بیوی کے لیے کوئی ناممکن سی بات نہیں کہ وہاں سے یہاں تک بمشکل ڈیڑھ گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ وہ آئے گی اور ضرور آئے گی کہ چوتھے شوہر (بلکہ گھر شوہر) کو برطرف کرنے کا اس سے بہتر موقع اُسے نہیں مل سکتا۔ باجود اِس کے کہ میری شوہرانہ کارکردگی خاصی بہتر ہے۔ بیوی کا تصور آتے ہی کنپٹیاں بجنے لگیں پھر آہستہ آہستہ دماغ پُرسکون ہوتا گیا۔ شام ہو رہی تھی اور صحافی بھی جاگ پڑا تھا لیکن ہم دونوں زیادہ تر خاموش ہی رہے۔ ہم دونوں کو گزری رات کی بک بک جھک جھک یاد تھی۔ پولیس اسٹیشن کی بیرک میں دوسری رات شروع ہوئی تو صحافی کا ساتھ حوصلہ افزا لگا۔

☆☆☆

''لو سگریٹ پیو۔ گزری رات بھول جاؤ۔ آج کی رات گزارو۔ بندے کے سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ کرنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ ورنہ یہ قوم نہ کر لیتی۔'' صحافی نے رات کاٹنے کے لیے صلح کی پیش کش کی جو سگریٹ کے ساتھ ہی قبول کر لی گئی۔

''ڈکٹیٹروں کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ملک و قوم کو کس وقت اُن کی ضرورت پڑ گئی۔'' میں نے رات کاٹنے کے لیے گفتگو بہانہ کی۔

''میں تو یہ کہوں گا کہ بعض ڈکٹیٹر وقت سے بھی پہلے آ جاتے ہیں اور وقت کے بعد میں بھی نہیں جاتے۔ اب میرے ہی ملک کی مثال لے لو۔ یہاں جب بھی کوئی نیا ڈکٹیٹر آتا ہے۔ اپنے ارادوں کو کیموفلاژ کرنے کے لیے اپنا عہدہ خود منتخب کرتا ہے اور جانا بھول جاتا ہے۔ اب کی بار ہمارے ملک میں

اسے پیٹرن اِن چیف کہتے ہیں۔ عوام الناس اختصار اور حقارت سے محض چیف پر ہی گزارا کر لیتے ہیں۔''

صحافی نے پرے پڑی ماچس اُٹھاتے ہوئے کہا پھر ماچس کو شائستہ سے گالی دیتے ہوئے پرے پھینک دیا۔ کانسٹیبل کو آواز دی۔ تھوڑی دیر بعد ماچس آ گئی۔ صحافی نے سگریٹ سلگایا۔ پیار سے افتتاحی کش لگایا تو چہرے پر بھولی بسری آسودگی ذرا کی دیر کو لوٹ آئی۔

''آپ بھی یہاں غباروں کے سلسلے میں ماخوذ ہیں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''یہی سمجھ لو۔ لیکن غباروں سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ کوئی چار شمارے پہلے میں نے اپنے ایڈیٹر کے کہنے پر سماجی تقریبات پر ایک فیچر لکھا جس میں غباروں کی سماجی اہمیت پر کچھ زیادہ ہی زور دے دیا۔ قسمت خراب تھی ورنہ یہ فیچر میری صحافتی زندگی کا کارنامہ ہے۔ میں نے اس تاریخی فیچر میں اس بات کو بنیاد بنایا کہ غبارے ہماری سماجی اور گھریلو زندگی میں مسرت و خوشی کی علامت ہیں۔ نیز غبارے انسانی زندگی میں لطف و انبساط کا باعث اور ذریعہ ہیں اور ایسے قابلِ دسترس ذریعۂ مسرت کو عام انسانوں تک ضرور پہنچنا چاہیے تاکہ ملکی معاشرے کی آخری سطح تک لوگوں کو پریشانیوں سے ریلیف مل سکے۔ یہ آخری سطح تو میں نے تمہاری آسانی کے لیے کہا ہے ورنہ اِدھر تو گراس رُوٹ لیول چلتا ہے۔ تو یہ فیچر یوں سمجھو کہ میں نے خونِ جگر سے سجایا تھا۔ اس فیچر میں مَیں نے دو تصویریں لگائی تھیں۔ پہلی تصویر ایک سماجی تقریب کی تھی جس میں محض غباروں کی عدم موجودگی سے ہی ساری تقریب تعزیتی جلسہ لگ رہی تھی اور دوسری تصویر کی داد تو میں یوسف کارش سے بھی لے لیتا کہ تصویر خود بولتی تھی۔ یہ دوسری تصویر ایک متوسط طبقے کے خاندان کی تھی جو سالگرہ کے موقع پر لی گئی تھی۔ محض غبارے نہ ہونے کی وجہ سے سالگرہ کی یہ تقریب اُداسی اور مایوسی میں ڈوبی دکھائی دیتی ہے اور ایسے ہی تاثرات شرکا کے چہروں پر نظر آتے تھے۔ چچ__ چچ__ بھلا وہ بھی کوئی سالگرہ ہے جہاں غبارے نہ ہوں۔ یہ تصویر اتنی ٹریجک تھی۔ ٹریجک تو سمجھتے ہو ناں! (اس وقت ٹریجڈی کی ماہیت مجھ سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا۔) اتنی ٹریجک تھی کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ رنگ برنگے غباروں کے بغیر سالگرہ کی تقریب محض الوداعیہ معلوم ہوتی تھی۔ اب تم ہی بتاؤ اگر سالگرہ کی تقریب سے رنگ برنگے فینسی غبارے ہٹا دیئے جائیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔''

''ٹوپیاں''

''جی!؟''

''جی ہاں! ٹوپیاں۔ رنگ برنگی، چمکیلی، فینسی ٹوپیاں جو شرکاء نے سروں پر اٹکائی ہوتی ہیں۔''

''درست کہا'' صحافی نے مجھے داد بھری نظروں سے دیکھا ''اب محض ٹوپیوں کے سہارے تو کام نہیں چلایا جا سکتا ناں۔'' صحافی نے افسوس میں سر ہلایا۔ ''کل دفتر پر چھاپا پڑا تو سارا عملہ گرفتار کر لیا گیا۔ پروف ریڈر کو بطور خاص گرفتار کر لیا گیا کہ فیچر میں پروف کی بے شمار غلطیاں رہ گئی تھیں۔ پروف ریڈر کی اس حرام خوری نے متعلقہ سنسری افسر کو مزید مشتعل کر دیا۔ ہاتھوں میں جب فولادی کنگن پڑے تو گھگھیا

گیا، رونا تڑپنا شروع کر دیا۔ میرا تو خیال ہے کہ اُس کا پیشاب بھی خطا ہو گیا ہوگا۔ کس واسطے کہ ایسے موقعوں پر ایسا ہو جاتا ہے۔ باقیوں کو کسی اور پولیس اسٹیشن لے گئے اور مجھے یہاں لے آئے۔'' صحافی نے بات ختم کرتے ہی نئی سگریٹ سلگالی۔

''غبارہ موومنٹ پبلک چلا رہی ہے تو سیاسی لیڈر کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''جو باہر ہیں تو بہت باہر ہیں اور جو اندر ہیں تو بہت اندر ہیں۔'' صحافی نے فلسفیوں کی طرح رَمز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''اَئے کوڑھ مغز غیر ملکی نوجوان! تیرا دماغ کام کیوں نہیں کرتا؟ سُن! جو لیڈر جیل سے باہر ہیں تو پھر ملک سے بھی باہر ہیں اور جو ملک کے اندر ہیں تو پھر جیل کے اندر ہیں۔'' صحافی نے داد چاہنے والے انداز میں یوں کہا کہ داد دیتے بنی۔

''آپ ایسے کام کیوں کرتے ہیں جن میں خطرہ ہو'' میرا اشارہ صحافی کے یوں گرفتار ہونے کی طرف تھا۔

''دراصل خطروں سے کھیلنا میرے خون میں شامل ہے۔'' صحافی نے آنکھیں بند کر کے طویل کش لگایا۔

''درست کہا۔''

''کیا کہا؟''

بیرک میں خاموشی ہوتی، تو رات رُک جاتی۔ باتیں ہوتیں، تو لمحے چل پڑتے۔ سو اَب ہم دونوں کے پاس بولنے کے لیے بولنے کے سوا کوئی اور بہانہ نہ تھا۔

''ٹُلا بتا رہا تھا کہ تم غباروں کی ناجائز خرید و فروخت میں ملوث ہو'' صحافی نے مجھ سے پوچھا۔

''ٹُلا! کون ٹُلا؟'' میری آواز قدرے اونچی ہو گئی۔

''شش___ شش___ آہستہ بولو___ کہیں سُن نہ لیں___ اِدھر کانسٹیبل کی بجائے غیر سرکاری طور پر ٹُلا چلتا ہے___ کھی کھی کھی___ کہیں کہہ نہ دینا'' صحافی نے ہنستے ہوئے بارودی سُرنگ کی نشان دہی کی۔

''کیا کہہ رہا تھا ٹُلا؟'' میں نے ہنسی روکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

''یہی کہ تم غباروں کی ناجائز خرید و فروخت میں ملوث ہو'' صحافی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں! بلکہ جائز غباروں کی ناجائز خرید و فروخت کے ارادے کا مرتکب ہوا ہوں'' میں نے تصحیح کر دی۔

''اِدھر لا جک نہیں چلتا۔ اَب تک معلوم ہو چکا ہوگا'' صحافی کے گلے سے پہلی بار صحافی بولتا سنائی دیا۔

''آخر کوئی قانون تو ہوگا یہاں؟ یا یہ لاقانون ریاست ہے۔'' میرا لہجہ ایک دم تیز ہو گیا تو صحافی نے دھیما رہنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں! ہے قانون۔ لیکن اِدھر اِسے آرڈر آف دی ڈے کہتے ہیں۔'' صحافی نے اُبلتے لاوے پر ٹھنڈا پانی اُچھال دیا۔ کچھ لمحے اور خاموشی میں گزر گئے۔

''مجھے معلوم ہے مجھے کیا سزا ملے گی۔ یہ سزا تو میں نے تمہیں سمجھانے کے لیے کہا ہے، ورنہ اِدھر پیکج چلتا ہے۔ مجھے دس جوتے اور ایک ہفتے کی قید کا پیکج ملے گا۔ مختلف سیاسی جرائم کے مختلف پیکج ہیں___ اَب تو خیر جوتے کی لمبائی، چوڑائی، موٹائی اور وزن کم کر دیا گیا ہے۔ ورنہ شروع شروع میں تو جوتا (دائیں بازو سے مخش اشارہ کرتے ہوئے) یہ لمبا اور یہ موٹا ہوتا تھا۔ آج بھی یاد ہے۔ کبھی نہیں بھول سکتا۔ اگر آج بھی اپنی ہی سرینوں پر بھولے سے اپنا ہی ہاتھ پھیروں تو سوئی جلن ایک بار تو جاگ سی اُٹھتی ہے۔'' صحافی کا لہجہ اچانک ہی ناسٹلجک ہو گیا۔

''مجھے کیا پیکج ملے گا۔'' میں نے امتحاناً پوچھا۔

''ناجائز غباروں کی خرید و فروخت کے مُرتکب ہوئے ہو؟''

''یہی سمجھئے۔''

''پانچ سال قید سخت اور ہفتے میں چھ دن روزانہ دس گھنٹے خرگردی۔''

''خَرگردی؟ یعنی؟ کیا مطلب۔'' میں نے پوچھا۔

''گدھے کی طرح کام کرنا۔'' صحافی نے وضاحت کی۔

''گدھے کی طرح صرف کام کرنا ہوگا یا ساتھ میں ہنہنانا بھی ہوگا۔''

''ہنہنانے میں قطعاً کوئی حرج نہیں۔ بلکہ اِس سے تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا اور طبیعت بھی کام میں لگی رہتی ہے۔ سوا لگ۔''

نیند نہ مجھے آ رہی تھی اور نہ صحافی کو لیکن وقفے وقفے سے باہم جماہیوں کا تبادلہ کر لیتے۔

''دو سال پہلے ملک کے جس سب سے بڑے ڈیم کا افتتاح چیف نے کیا تھا۔ وہ غبارہ موومنٹ کے گرفتاروں کی خَرگردی کا عین ثبوت ہے۔ آج کل غبارہ موومنٹ کے گرفتار جنوبی ساحلوں پر تعمیر ہونے والی اور ملکی معیشت میں سنگِ میل ثابت ہونے والی بندگارہ کی تعمیر میں اپنی خرگردی کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ کارکن بے چارا کسی نہ کسی طرح ملک کی تعمیر و ترقی میں لگا ہوا ہے۔'' صحافی کا لہجہ آہستہ آہستہ پھر مارکسی ہوتا جا رہا تھا اور یہ خطرناک بات تھی۔

صحافی خاموش ہو گیا کچھ دیر اور یونہی خاموشی رہی پھر مجھے اُونگھ آ گئی۔ معلوم نہیں کب سردی سے میری آنکھ کھلی۔ ویسی ہی خاموشی۔ یہ بیرک بلڈنگ کے ایک الگ تھلگ کونے میں ہے۔ جس میں خصوصی مجرموں کو رکھا جاتا ہے۔ خلاف معمول سگریٹ کی طلب ہوئی۔ صحافی کی طرف دیکھا تو وہ فرش پر

جھکا ہوا، بیرک کی زرد مدھم روشنی میں فرش پر کاغذ پھیلائے کچھ لکھ رہا تھا۔ میں بھی دیکھا کیا کہ آخر صحافی رات کے آخری پہر اِس ماحول میں کیا خاص چیز لکھ رہا ہے۔ صحافی نے قلم بند کر کے سامنے پڑے کاغذوں کے پلندے پر رکھا اور ذرا اُونچی آواز میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے اُسے اِس کام کے ختم کرنے کی ہمت بخشی۔ پھر ایک بھرپور انگڑائی لی۔

''فیچر لکھ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں! تم سو گئے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ ہوم ورک کرلوں کل عدالت میں حاضر ہونا ہے تو یہ بھی عدالت میں پیش کرنا ہے۔ اگر یہ ہوم ورک کر کے نہ جاؤ تو عدالت اَصل پیکج کے ساتھ ساتھ سپیشل پیکج بھی دیتی ہے۔ جو اُس سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ آسان سا ہوم ورک ہوتا ہے اِسے بیان حلفی قسم کی کوئی چیز سمجھ لو۔'' یہ کہتے ہوئے صحافی نے کاغذوں کا پلندا میرے سامنے دھکیل دیا۔ غنودگی، کہولت، کمزوری اور کم روشنی کے سبب مجھے دُھندلاتو کیا، کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔

''تم سمجھنے میں وقت لوگے اور اِدھر وقت کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔ ہر ورق کے ایک طرف لکھا جاتا ہے اور ہر صفحے پر بیس بیس اُفقی خانے دس دس عمودی لائنوں میں بنے ہوتے ہیں۔ صفحوں کا شمار نہیں ہوتا بلکہ پہلے خانے سے لے کر آخری خانے تک ترتیب وار نمبر لگے ہوتے ہیں۔ اگر ایک صفحے پر بیس خانے ہوں تو ہزار خانے کتنے میں صفحوں میں آئیں گے۔'' صحافی نے میری طرف دیکھا۔

''پچاس صفحوں میں'' اندر کا اکاؤنٹینٹ فوراً جاگا۔

''تم نے کہا تھا کہ تم اکاؤنٹینٹ ہو، لیکن اکاؤنٹینٹ اتنے احمق تو نہیں دِکھتے۔ بہرحال وَیل ڈَن۔ ہوم ورک یہ ہوتا ہے کہ صرف اِتنا لکھنا ہوتا ہے۔ 'میں پاگل ہوں'۔ وہاں تک جہاں تک سُرخ لائن نہ آجائے اور وہاں متعلقہ عدالت کی مہر لگی ہوتی ہے۔ یہ ہوم ورک والے پلندے حاضری والے دن ہی' تاریخ تبدیل ہوتے ہی ملزموں کو جاری کر دیئے جاتے ہیں تاکہ حساب سیدھا رہے۔''

''تمام خانوں میں 'مَیں پاگل ہوں' کا حلفیہ بیان لکھنا پڑتا ہے؟''

''ہاں تمام خانوں میں۔''

''آخر کتنے خانوں میں___ کوئی حد تو ہوگی۔''

''اَب خاصا بہتر سوال کیا ہے تم نے___ ہاں حد ہوتی ہے۔ صرف اُتنے خانوں میں، جتنے دن اِس عہدِ انحطاط کو ہو گئے ہوں۔ عدالت میں حاضری والے دن تک۔ کتنے سیٹ ہیں؟'' صحافی نے ہوم ورک کے پلندے کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''چار سیٹ ہیں'' میں نے سیٹ گنتے ہوئے کہا۔

''ہر سیٹ پچاس اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر بیس خانے بنے ہیں یعنی سیٹ میں ایک ہزار خانے اور چار سیٹوں میں چار ہزار خانے۔'' پھر آخری سیٹ کا آخری صفحہ سامنے کرتے ہوئے کہا ''آج

اِس دَورِ جبر کا تین ہزار نوسو نوے واں دن ہے۔ یوں سمجھو کہ گیارہواں سال بھی ختم ہونے کو ہے۔'' صحافی کی آواز ڈوبتی گئی پھر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

''مجھے بھی لکھنا پڑے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''کک۔ کیا؟'' صحافی چونکا۔

''میں پاگل ہوں۔'' میں نے کہا۔

''قطعاً نہیں۔ یہ بیانِ حلفی صرف ادیبوں، صحافیوں وکیلوں اور پروفیسروں کے لیے مختص ہے۔ اگر تمہارے جیسے لوگوں کو بھی یہ ہوم ورک ملنے لگے تو کاغذ کہاں سے آئے اتنا۔'' صحافی نے اپنے اور میرے درمیان ایک لکیر کھینچ دی۔

اَب آہستہ آہستہ صبح کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن بیرک میں وہی زرد روشنی اور سڑاندی سی ٹھنڈ کا' مُردہ گھر کے جیسا ماحول تھا۔

''جب پہلی بار میں نے یہ ہوم ورک کیا تھا تو مجھے تین سو پینسٹھ بار اپنے پاگل ہونے کا حلف دینا پڑا تھا۔ خود سمجھ لو اِس دورِ جبر کے ٹھیک ایک سال بعد مَیں گرفت میں آیا تھا۔ میں جس سطح کا صحافی ہوں اُتنا ہی احتجاج افورڈ کر سکتا ہوں۔ اُن دنوں اگر جوتا وزنی ہوتا تھا تو میں بھی جوان تھا۔ اَب تو جوتے کے سائز اور وزن نے سزا کو مذاق بنا دیا ہے۔'' صحافی کا لہجہ افسردہ ہو گیا جیسے آج کل کی سزا کے معیار سے غیر مطمئن ہو۔

''جسمانی سزا اگر مِل جائے تو پھر وقت نہیں ہوتا سوچنے سمجھنے کا، کیونکہ یہ سزائے معجّل ہوتی ہے۔''

''کیا ہوتی ہے۔''

''معجّل''

''کیا مطلب''

''فوری سزا۔ عدالت کے فیصلہ سنانے کے فوراً بعد___ اور وہیں۔ عدالتوں کے قریب ہی سزائے معجّل کا اہتمام ہوتا ہے۔''

سگریٹ وافر تھے لہٰذا سگریٹ سے سگریٹ سلگتے رہے۔ صحافی کی صحبت میں مجھے بھی سگریٹ پھونکنے پڑ رہے تھے۔ زیادہ سگریٹ بندے کو نہ سونے دیتے ہیں اور نہ جاگنے کا چھوڑتے ہیں۔ کچھ یہی کیفیت میری تھی۔ خاموشی طویل ہوتی گئی۔

''عدالت میں کہہ دینا کہ کنڈوم احتجاج کے لیے نہیں بلکہ اِختلاط کے لیے خریدنا چاہتے تھے اور بس۔ اور اِس کی سزا اتنی سی ہے کہ تمہیں فوراً اِس ملک سے دفعان کر دیا جائے گا۔ یہ دفعان تو میں نے تمہیں سمجھانے کے لیے کہا ہے۔ ورنہ اِدھر ڈی پورٹ چلتا ہے۔'' صحافی نے تو سیدھا سا راستہ بتا دیا۔ لیکن مالدار کے ساتھ ساتھ خونخوار فی میل شاؤنسٹ قسم کی بیوی فوراً طلاق دے دے گی اور پھر وہی۔۔۔ تو

دوسری صورت میں غیر ملک میں پانچ سال قیدِ سخت سمیت خَرگردی کے۔ نکے پن اور آسودہ حالی نے کتنا آرام طلب بنا دیا ہے اور کھال بھی خاصی نرم ہو چکی ہے۔۔۔ یا خدا کیا کروں۔

''ورنہ دوسری صورت میں مَیں نے تمہیں تمہارا پیکج بتا ہی دیا ہے۔ لہٰذا عدالت میں جاؤ تو پُر سکون ہو کے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیشاب خطا ہو جائے۔ کس واسطے کہ ایسے موقعوں پر ایسا ہو جاتا ہے اور اگر شہرت کی خاطر عدالت میں ڈِکٹیٹر شپ کے خلاف کوئی تاریخی تقریر کر بھی دی۔ تب بھی شہرت نہیں ملنے کی۔ کیونکہ سنسر شپ خود حکومت سے بھی زیادہ مضبوط ہے اور تم عدالت سے سیدھے عقوبت میں۔'' پھر خاموشی چھا گئی۔ صحافی تو شاید آنکھیں پھاڑے سرنگ کے اُس پار چمکتا نقطہ دیکھتا رہا اور مَیں اونگھنے لگا پھر شاید نیند آ گئی۔ آپ کو بتایا ہے ناں مجھے ٹینشن میں نیند آنے لگتی ہے۔

صحافی عدالت کے لیے روانہ ہونے لگا تو خاصا پُر سکون تھا۔ سگریٹ وہیں میرے پاس ہی چھوڑ دیئے کہ شغل کرتا رہوں اور پریشان نہ ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے کانسٹیبلوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں پھر سو گیا اور گہری نیند سویا۔ بیرک کا دروازہ کھلنے پر جاگا۔ کانسٹیبل صحافی کو لائے تو وہ پہلے سے بہتر لگ رہا تھا۔

''پیکج نہیں ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''مِلا۔ لیکن محسوس نہیں ہوا۔'' صحافی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''ایڈیٹر کو کون سا پیکج ملا۔''

''بہتر پیکج ملا۔''

''چھوڑ دیا اُسے؟''

''نہیں، بیس پڑے ___ اور وہ بھی میرے سامنے ___ پہلے ہی پہ گھگھیا گیا ___ میرا کہنے لگا کہ پہلے اِسے۔ اُنہوں نے کہا ایڈیٹر پہلے۔ پندرہ دن قید بھی کاٹے گا جن میں سات دن خرگردی کے۔'' صحافی نے آخر پہ گالی کا پشتہ لگایا۔

رات سے پہلے ہی صحافی کو جیل بھیج دیا گیا۔ اُس نے جاتے جاتے مجھے مشورہ دیا کہ بیوی کی موجودگی میں بھی کہہ دینا کہ کنڈوم محض خرید رہا تھا۔ کچھ کرنے ورنے کا فی الحال نہیں سوچا تھا وغیرہ وغیرہ۔ بیوی سے کہہ دینا تم یاد آ رہی تھیں۔ یا یہ کہ طبیعت مچل رہی تھی وغیرہ وغیرہ۔ عورت عموماً مرد کو معاف کر دیا کرتی ہے۔ اِس سے یہ ہو گا کہ پیکج سے بچ جاؤ گے۔ ورنہ وہی پانچ سال قیدِ سخت اور وہ بھی غیر ملک میں۔ صحافی مشورہ دے کر چلا گیا۔ میں صحافی کو کیسے سمجھاتا کہ میری بیوی، عورت شوہر اور مَیں مرد بیوی ہوں۔

☆☆☆

آج اِس بیرک میں میری تیسری رات ہے۔ کل عدالت میں مجھے پیش کیا جائے گا۔ رات شروع ہوئی تو تنہائی کا احساس گہرا ہوتا گیا۔ وہ صحافی جو پچھلے دو دن اور دو راتوں تک کبھی نعمت لگا تھا تو کبھی مصیبت، کبھی غنیمت تو کبھی فالتو۔ آج رات بہت یاد آ رہا ہے۔ وہ صحافی زندگی سے کتنا بھرپور تھا۔ مجال

ہے جو کسی وقت گھبرایا ہو۔ کتنے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اُس کے میٹھے بول اور میرے بارے میں اُس کے پیار بھرے تبصرے کتنا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ کتنا اپنا سمجھتا تھا مجھے ___ صحافی کی یاد اور تنہائی کی شدت نے آنکھیں گیلی کر دیں۔ سچ کہتا تھا صحافی 'جب تک ذاتی تجربہ نہ ہو ڈِکٹیٹر شپ سمجھ میں آنے والی چیز نہیں'۔ میں نے کانسٹیبل کو آواز دی۔ خاصی دیر کے بعد کانسٹیبل آیا۔

''کیا بات ہے۔'' کانسٹیبل نے سلاخوں سے جھانکتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''میرا ایک کام کر سکتے ہو؟''

''بولو۔''

''کچھ سفید کاغذ اور قلم مل جائے تو مہربانی ہو گی۔''

''دیکھتا ہوں۔''

طویل انتظار کے بعد کانسٹیبل کچھ کاغذ اور قلم دے گیا۔ کاغذ سامنے رکھے میں دیر تک سوچا کیا کہ اِن کا کیا کروں۔ پہلے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔ پھر بیرک میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹہلتے ٹہلتے خیال آیا کہ لوگ بھی تو بیرون ملک کی سیر کے احوال لکھتے ہیں اور چھاپتے ہیں جنہیں شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ کیوں نہ میں بھی بیرونِ ملک کے اپنے سفر کی رُوداد لکھوں۔ اپنے لیے، کسی گمنام کے لیے، صرف وقت گزارنے کے لیے، صرف تنہائی کاٹنے کے لیے۔ سو میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور اس ملک میں اپنی آمد سے اَب تک کے احوال لکھنا شروع کر دیئے۔

اور اَب لکھتے لکھتے اِس جگہ آ پہنچا ہوں کہ جس کے بعد آگے کچھ ہوا ہی نہیں تو آگے کیا لکھوں؟ صبح ہونے والی ہے۔ کچھ دیر بعد مجھے عدالت لے جایا جائے گا۔ اگر ایک فیصلہ عدالت کو کرنا ہے تو ایک فیصلہ مجھے بھی کرنا ہے کہ میں عدالت میں کیا کہوں۔ مَیں کنڈوم کیوں خریدنا چاہتا تھا؟ اگر احتجاج کے لیے کنڈوم خریدنا چاہتا تھا تو غیر ملک میں پانچ سال قیدِ سخت اور خرگردی اور اگر مَیں عدالت کو یہ بتاتا ہوں کہ کنڈوم کو اُس کے حقیقی استعمال کے لیے خریدنا چاہتا تھا تو بیوی اُسی وقت طلاق دے دے گی۔ آناً فاناً سب کچھ ہی ختم ہو جائے گا۔ پھر وہی بے روزگاری اور خالی جیب، سخت بستر اور خالی پہلو۔

عدالت کے فیصلے کا دارومدار میرے فیصلے پر ہے کہ میں دو ہی ممکنہ مقاصد میں سے کسی مقصد کے لیے کنڈوم خریدنا چاہتا تھا۔ بالکل کچھ سجھائی نہیں دے رہا کہ میں کیا فیصلہ کروں؟ عدالت تو میرے فیصلے کے بعد ہی فیصلہ کرے گی اور یہ رعایت بھی اِس لیے کہ مَیں غیر ملکی ہوں۔ ورنہ ملکی ہونے کی صورت میں تو کنڈوم خریدنے کی وجہ بھی نہ پوچھی جاتی۔ مجھے نیند آ رہی ہے' لگتا ہے ٹینشن بڑھ رہی ہے۔ یونہی سوال نُما خیال سا آ رہا ہے 'اگر آپ میری جگہ ہوتے، آپ کیا فیصلہ کرتے؟'

☆☆☆

لیاقت علی

روشنی

وہ ابھی تک اسی مخمصے میں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا؟

شاید زندہ ہے؟

ممکن ہے مر چکا ہو؟

ہاں مرنے سے پہلے اُسے یاد تھا کہ لوگ تیزی سے اپنے اپنے گھروں سے بھاگ رہے تھے۔

نجانے وہ کیا کہہ رہے تھے؟

ہاں یقیناً وہ روشنی کی خبر پر تیزی سے باہر نکل رہے تھے۔

بستی میں پہلی مرتبہ سورج طلوع ہوا تھا۔ اس خبر نے سبھی کو اس قدر مسرور کر دیا تھا کہ وہ یہ تک بھول گئے تھے کہ وہ بستر پر پڑا زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔

سنو! باہر سورج نکل آیا ہے۔

سورج! ایک بچے نے اس انجان شے کا نام سن کر باپ سے پوچھا جو خود بتانے والے کو تشکیک بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

میں سچ کہہ رہا ہوں۔ باہر روشنی پھیل رہی ہے۔

وہ یقین دلا رہا تھا۔

بچے کی حیرت اور باپ کا شک بدستور قائم تھے۔

اور وہ۔۔۔ وہ بستر پر مرنے سے پہلے کے چند ثانیے گزار رہا تھا۔

زندگی سے اس کا رابطہ اب اپنی چند ثانیوں پر مشتمل تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُسے جاگتے قدموں کی تیز چاپ گھر کے اندر باہر ہر طرف سے سنائی دینے لگی۔

سب ایک دوسرے کو بتا رہے تھے سورج نکل آیا ہے۔

نجانے بتا رہے تھے یا پوچھ رہے تھے؟

وہ دیکھ سکتا تو یقیناً اس کا تعین کرتا مگر اب اس حالت میں وہ محض قیاس کر سکتا تھا اور حواس سے اس کا رابطہ محض چند گھڑیوں پر مشتمل تھا۔ پھر اُسے بستی کے سب سے بوڑھے شخص کی تیقن بھری خوشی سے تھرتھراتی آواز سنائی دی۔

بالآخر سورج نکل آیا۔

بستی میں روشنی پھیل رہی ہے۔

اور پھر ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔

سبھی جیسے ہلڑ مچاتے، بھاگتے، گرتے، گھروں سے باہر نکل گئے۔

وہ جب سے پیدا ہوا تھا اُس نے روشنی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی بستی پر کبھی سورج طلوع ہی نہیں ہوا تھا تو وہ روشنی کیسے دیکھتا اور سورج بھی طلوع ہوتا تو کیونکر ہوتا اس کی بستی پہ تو آسمان ہی نہیں تھا۔

ایک موٹی سیاہ چادر تھی جو اس کے پیدا ہونے سے بھی پیشتر اس بستی پر تنی ہوئی تھی اور مسلسل روشنی اور ہوا کو روکے ہوئے تھی۔ اس کی بستی کے سبھی پودے ایک عرصے سے کہ جب سے وہ پیدا ہوا لہلہانا بھول چکے تھے۔ پھول تھے مگر خوشبو نہیں تھی۔ پھل تھے مگر رس نہیں تھا۔

لوگوں میں لڑائی زمین کی نہیں تھی کہ ایک عرصہ ہوا لوگ زمین کی لڑائی بھول چکے تھے۔ اب اپنی حصے کا آسمان درکار تھا۔

اپنے حصے کا آسمان وہ تمنا تھی جو بستی کے بے شمار مکین اپنے اپنے دلوں میں لیے بالآخر رخصت ہوئے اور اب وہ بھی تو یہ تمنا لیے جا رہا تھا کہ یہ خبر اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

سورج نکل آیا ہے۔

روشنی پھیل رہی ہے۔

اُسے روشنی، سورج اور ہوا سے متعلق یہ قصے اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملے تھے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ پہلے پہل جب آسمان پر تسلط قائم ہوا تو زمین کے مکینوں نے سخت مزاحمت کی تھی۔ لوگ گھپ اندھیرے اور شدید حبس میں گھروں سے بیلچے، چھریاں، چاقو، تلواریں، بندوقیں غرض مقدمہ بھر سبھی اوزار لے کر نکلتے تھے۔

لیکن پھر بہت سوں نے ایک دوسرے کو یقین دلانا شروع کر دیا کہ کیا خبر اب آسمان کی بدلی ہوئی صورت ہی یہی ہو؟ جب ہر شے بدل رہی ہے تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ آسمان بھی بدل گیا ہو؟

وہ اور اُس جیسے بہت سے دوسرے بچے جب آسمان اور سورج سے متعلق یہ دلچسپ قصے سنتے تو حیران رہ جاتے۔ پھر آہستہ آہستہ بستی سے وہ بزرگ رخصت ہونے لگے جو ان قصوں کے براہِ راست کردار تھے۔ وہ اِن قصوں کو بڑھا چڑھا کر بچوں کی دلچسپی کو قائم رکھنا چاہتے تھے کہ مبادا وہ روشنی اور ہوا کے مفہوم سے ہی ناآشنا ہو جائیں اور یہ جان ہی نہ پائیں کہ ان کے اوپر تنی سیاہ چادر کے اس پار کوئی نیلا آسمان بھی ہے جہاں سورج ہے، روشنی ہے۔

مگر اپنے تجربے سے خالی سچائی پر کوئی بہت دیر تلک اعتبار کیسے قائم رکھ سکتا ہے۔ اپنی واردات سے خالی ہوں تو معجزے بھی اعتبار کھو دیتے ہیں۔

اور پھر وہی ہوا جس کا کہ اندیشہ تھا۔ روشنی کے قصے، ہوا کی باتیں اور سورج سے منسوب کہانیاں اپنے اندر چھپی دلچسپی اور اثر کھونے لگیں۔

اب بچے ایسے نا قابلِ یقین قصوں میں دلچسپی سے کترانے لگے۔

اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں کو وہ گروہ بھی تو تیار ہوا جو کہنے لگا چھوڑو یہ سب پرانی خیالی باتیں ہیں۔

اِن چھوٹے اور فرسودہ مفروضوں پر یقین چھوڑو۔

کیسا آسمان؟ کون سی روشنی؟ کہاں کی ہوا؟

یہی آسمان ہے۔ یہی روشنی ہے۔ یہی ہوا ہے۔

نہیں یہ روشنی نہیں ہے۔

یہ جو تم دیکھ رہے ہو یہ آسمان نہیں ہے ایک بڑی سیاہ چادر ہے جس پر مصنوعی قمقمے جڑے ہیں جہاں سے حسبِ ضرورت روشنی یہ بستی تک پہنچائی جاتی ہے۔ یہ من بھائی روشنی ہے۔

من بھائی روشنی؟

ہاں من بھائی روشنی علاقوں اور لوگوں میں تقسیم کی جانے والی مصنوعی روشنی جسے وہ اپنی مرضی سے بانٹ رہے ہیں۔ ہاں سنو اب ہوا اور روشنی پر دسترس پا چکے ہیں۔

کیا تم نے کبھی بارش دیکھی ہے؟

بارش!

کبھی بادلوں کی گرج سنی ہے؟

بادل!

کبھی تیز ٹھنڈی ہوا میں لہلاتے پیڑوں کو دیکھا ہے؟

تیز ٹھنڈی ہوا!

وہ اور اُس جیسے شاید ابھی کئی باقی تھے جن کی دلچسپیاں ابھی ان قصوں میں قائم تھیں۔

وہ دل ہی دل میں روشنی، بادلوں، بارشوں اور لہلاتے کھیتوں سے متعلق تصورات قائم کرتے رہے تھے۔

یہ بارش کیسی ہوتی ہوگی؟

ہاں ایسی۔ نہیں ویسی۔

ہاہا۔ سنید محض قہقہہ لگاتا۔ بارش!

نہیں ایسی نہیں۔ پھر کوئی بزرگ اپنے گم گشتہ تجربے کو زندہ کرنے کی کوشش کرتا۔ آسماں پر بادل چھاتے ہیں۔ بادلوں سے بارش برستی ہے۔

بہت سا پانی جو تیز قطروں کی صورت برستا ہے اور ہر شے کو جل تھل کر دیتا ہے۔ پھر مٹی سے خوشبو اُٹھنے لگتی ہے۔ سوندھی سوندھی خوشبو۔ ایسی خوشبو جو مٹی کھانے پر اُکساتی ہے۔ پھر بادل چھٹتے ہیں تو قوسِ قزح کے رنگ اپنا حسن بکھیرنے لگتے ہیں۔ آسمان دُھل کر کیسا شفاف ہو جاتا ہے۔

آسمان!

پھر ایک نا قابلِ یقین حقیقت کا تصور اُبھرنے لگتا۔

بابا پہلے یہ تو بتائے آسمان کیسا ہوتا ہے؟

کسی کو کیا جواب ملتا جب آسمان کا تصور ہی ممکن نہیں تھا تو پھر بارشوں، بادلوں اور قوسِ قزح کے رنگوں پر اعتبار کیسے آسکتا تھا۔

پھر ایک روز آخر تنگ آ کر اُس نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ سب جھوٹ ہے۔

فقط جھوٹی کہانیاں اور من گھڑت قصے جو ہمیں فریب میں مبتلا کرنے کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ یہی روشنی ہے۔ یہی آسمان جو ہمارے عہد کا، ہمارا اپنا تجربہ ہے۔ اس اَن دیکھی سچائی سے ہمارا کیا واسطہ کہ جس کا انتظار کرتے کرتے سبھی آہستہ آہستہ رخصت ہو رہے ہیں۔

اور آج وہ بھی تو مر چکا ہے۔

مر چکا ہے؟

شاید؟

ہاں مگر مرنے سے پہلے اُس کے کانوں میں ضرور یہ آواز گونجی تھی۔

چلو سورج نکل آیا ہے۔

چلو روشنی پھیل رہی ہے۔

اس آواز نے روشنی، ہوا اور لہلاتے کھیتوں اور خوش کن قصوں کے وہ اَن دیکھے تصورات پھر سے زندہ کرا دیے تھے جنہیں وہ اب رڈ کر چکا تھا۔

ہاں رڈ کر چکا تھا شاید بھولا نہیں تھا۔

سبھی تو ایک لمحے میں پھر سے زندہ ہو گئے تھے۔

لیکن اب تو وہ مر رہا تھا۔ یا شاید مر چکا تھا۔

پھر اچانک اُسے یہ خیال آیا وہ ابھی مرا نہیں ہے۔

ہاں مرا نہیں ہے۔

اگر مر گیا ہوتا تو سوچ کیسے سکتا؟

پھر بڑی اماں کی بات یاد آئی۔

پہلے جسم مرتا ہے۔

پھر زبان۔

پھر بینائی۔

پھر سماعت۔

اور سب سے آخر میں دماغ۔ دماغ آخری لمحے تک موت سے لڑتا ہے۔

اُس نے جسم کو ہلانا چاہا لیکن نہیں ہلا پایا۔
پھر زور سے بولنا چاہا لیکن اس کی زبان میں جنبش تک نہ ہوئی۔
آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا مگر نا کام رہا۔
کچھ سننا چاہا مگر کیا سنتا گھر میں سوائے اُس کے تھا ہی کون کہ وہ جس کی آواز سے یہ اندازہ لگا سکتا کہ وہ سن سکتا ہے سبھی تو باہر روشنی کا سواگت کرنے نکلے ہوئے تھے۔
تو کیا وہ مر چکا ہے؟
نہیں مرا ہوا شخص سوچ کیسے سکتا ہے۔
یکا یک اس خیال نے اُس کے اندر زندہ رہنے کی خواہش کو پھر سے تقویت بخشی اور اس نے اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کر کے آنکھیں کھولیں تو وہ حیران رہ گیا۔
وہ دیکھ سکتا تھا۔
پھر اسے ارادے کے ساتھ جسم کو حرکت دی۔
وہ حرکت کر سکتا تھا۔
اب پوری قوت سے اس نے لفظ روشنی بولنا چاہا تھا۔
وہ بول سکتا تھا۔
کانوں میں اپنی ہی روشی کی پکار اس کی سننے کی اہلیت کا پتہ بھی دے رہی تھی۔
وہ اُٹھا اور آہستہ آہستہ گھر کے دروازے تک پہنچا۔
باہر لوگ شور مچاتے، نعرے لگاتے، گرتے پڑتے نئے سورج کا استقبال کرنے جا رہے تھے۔ خوشخبری سنانے والے اس اعتماد اور جوش سے لوگوں کو روشنی کی خبر دے رہے تھے کہ دلوں کا شک کچھ دیر کو رفع ہو گیا تھا اور دیکھنے والی آنکھیں ابھی گزرے کل تک کے منظر کو فراموش کر بیٹھی تھیں۔
کونسا سورج؟
کیسی روشنی؟
یہ سب تو وہی ہے جو روز ہوتا ہے۔
صرف اُسی نے خبر کے بجائے بینائی پر اعتبار کیا تھا۔
ہاں سُنو! مرنے سے پہلے سب کچھ ایک دفعہ صاف نظر آتا ہے۔
بڑی اماں نے یہ بھی تو کہا تھا۔
یہ آخری خیال تھا جو اس کے دماغ میں پیدا ہوا۔
ہاں یقیناً اب وہ مر چکا تھا۔

☆☆☆

اوریانہ فلاشی/ خالد سعید

قسط ۱۲

ایک مرد

اس بار تھیوفلیوانکوس(Theophiloiannakos) کا طیش اور غصہ تمام حدوں کو پار کر گیا تھا۔ ''مجھے بتاؤ کہ تو نے اتنی دبیز دیوار میں کیسے اتنا بڑا سوراخ کیا؟ اور کون سا اوزار یا ہتھیار استعمال کیا؟'' ''چمچ کے ساتھ۔'' ''بکو مت مت، خرافات، ناممکن، اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے سیدھی طرح بتا دو کہ اس سلسلے میں کس کس نے تمہاری مدد کی، تمہارے دیگر شریک جرم ساتھیوں کے نام؟'' ''کوئی بھی نہیں سرکار۔'' ''کاذب، منافق، یہ صریحاً غلط بیانی ہے! اور میں تمہیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ بہت جلد تم خود ہر شے کا اعتراف کر لو گے!'' ''اچھا تو پھر سنو، تمہاری جعلی ڈگریوں میں سے ایک کی بتی بنا کر، جاہلوں کے چیف ایگزیکٹو، تم ابھی تک شاید مجھے سے واقف نہیں، بہرحال اِن اعترافات کے ساتھ اپنے چوتڑ صاف کرو، یہ بہت ہی غلیظ اور متعفن ہیں اور انہیں صفائی کی اَشد ضرورت ہے!'' ''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا!'' اس سارے ہنگامے اور قضیے میں جنرل آئیونیڈیز(Ioannidis) بدستور پرسکون اور شانت رہا اور اُس نے کسی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ وہ کوئی لفظ ادا کیے بغیر تمہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اُس کا سرد، درشت اور سخت چہرہ خلافِ معمول مربیانہ انداز میں آسودہ دکھائی دے رہا تھا اور کافی دیر کے بعد اُس نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا: پانا گاولس، پانا گاولس! میں انہیں مسلسل یہی کہتا رہا کہ تمہیں گولی مار دینا چاہیے تھی! سارا قصور پاپا ڈوپاولس(Papadopoulos) کا ہے،'' اُس کے خصیوں میں اتنی رطوبت ہی نہیں تھی کہ تمہیں مار گراتا!'' کچھ دیر کے بعد ایتھنز زون کا کمانڈنگ آفیسر فائڈوگزیکس(Phaed Gizikis) وہاں آیا، یہ وہی آفیسر تھا کہ جس نے تمہاری سزائے موت پر عمل درآمد کے حکم پر دستخط کیے تھے۔ وہ پژمردہ اور اداس دکھائی دے رہا تھا اور اُس نے اپنی جیکٹ کے بائیں بازو پر ماتمی پٹی باندھ رکھی تھی: چند دن پہلے اُس کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ تم بندھے ہاتھوں کے ساتھ ننگے فرش پر پڑے تھے اور تمہارے قریب کھانے کی ٹرے پڑی تھی جسے تم نے اَب تک قطعاً چھو کر نہ دیکھا تھا۔ وہ تم پر جھکا اور اُس نے تم سے مخاطب ہو کر کہا: مسٹر پانا گاولس! براہِ کرم تھوڑا سا کھانا کھا لو۔ اِن چودہ مہینوں میں وہ پہلا شخص تھا، جس نے تم سے ایک مہذبانہ انداز میں بات کی اور تم نے بھی اُس کی بات کا جواب شائستہ طور سے دیا: ''چھری کانٹے کے بغیر کیسے جناب؟ معاف کرنا جنرل، لیکن میں کوئی کتا تو نہیں، یوں اور اس حال میں کیسے کھاؤں؟'' ''مسٹر پانا گاولس، میں جانتا ہوں، مجھے پوری طرح علم ہے، لیکن تمہیں بھی تو اُن کے مشتعل جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے، ذرا سوچو تو کہ جب کبھی وہ تمہیں کھانے کے لیے چمچ مہیا کرتے ہیں تم اُسے کام میں لا کر دیوار میں اتنا بڑا سوراخ کھود دیتے ہو!'' ایک

خیال جیسے تمہارے ذہن کے آسمان میں کوندا، ہاں، بالکل یہی وہ شخص ہے کہ جس کے وسیلے تم زاکاراکس (Zakarakis) اور اُس کے ساتھیوں سے اپنا پورا انتقام لے سکتے ہو۔ وہ لوگ کہ جنہوں نے تمہیں یوں بے طرح شرمسار اور خجل کیا اور تمہارا ٹھٹھہ اُڑایا۔ اگر تم کسی صورت اس مہذب، شائستہ مگر حاکمانہ شخص کو قائل کرلو، تو کسی مشکل کا سامنا کیے بغیر اُن لوگوں کو جال میں پھنسا کر انہیں شکنجے میں کس سکتے ہو۔ تم نے اُس کی بے تصنع آنکھوں میں جھانکا، اور اپنے چہرے کے ہر ہر پٹھے کو یوں سکڑا کہ جس سے انتہائی حیرت کا اظہار ہوتا تھا: ''جنرل صاحب! آپ ایک سمجھدار شخص ہیں اور بلاشبہ کم از کم آپ کو اُس چیچ کتھا پر کوئی وشواس نہیں ہوگا؟ ایک دیوار کوئی کسٹرڈ یا کیک تو نہیں ہوتی!'' ''مسٹر پانا گاولس، یہ تم نے کیا کہا؟ تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا بات کر رہے ہو؟'' ''جناب والا میں اِس بات کا اعتراف کر رہا ہوں کہ میرے فرار میں انہی محافظوں نے میری مدد کی جنہوں نے مجھے بعد ازاں گرفتار کیا۔ مجھے زاکاراکس (Zakarakis) سے مدد ملی۔ اُسی نے یہ منصوبہ تیار کیا اور مجھے فرار پر اُکسایا۔ اُسے پوری اُمید تھی کہ میرے فرار کی کوشش کے بعد، پیٹسوروکوس (Patsoroukos) کی مانند اُس کا بھی یہاں سے تبادلہ ہوجائے گا اور یوں اس جگہ سے اُس کی نجات ہوجائے گی۔ میرے سان گمان میں بھی یہ دھیان نہ آیا کہ وہ میرے ساتھ دوہرا کھیل، کھیل رہا ہے۔ مجھے یہ کہنے پر معاف کر دیجیے کہ میں نے اُس کی تجویز کو مان لیا، لیکن اگر آپ بھی میری جگہ ہوتے تو یہی کچھ کرتے جب جیل خانے کا کمانڈنٹ خود چل کر قیدی کے سیل میں آئے اور اُس سے کہے، ''آؤ ایک معاہدہ کرتے ہیں، تم جیل سے بھاگنا چاہتے ہو، اور میں یہاں سے تبادلہ چاہتا ہوں، بلاشبہ ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں؛ اور اسی طرح کی دیگر باتیں، اور جب وہ اس سلسلے میں اپنے مسلح محافظوں کو بھی قیدی کی تحویل میں دے دے اور اُسے آزادی کے سراب کی جھلکی دکھائے، تو پھر اُس پر اعتبار تو مجھے کرنا ہی پڑا۔ البتہ اَب میں کبھی کبھی یہ ضرور سوچتا ہوں کہ آیا یہ دوہرا کھیل شروع سے ہی اس کے منصوبہ کا حصہ تو نہیں تھا: بظاہر وہ میرے ساتھ انتہائی مخلص دکھائی دیتا تھا! یا ممکن ہے بعد میں اُس نے اپنا ذہن اس خوف سے بدل لیا ہو کہ کہیں کوئی محافظ اس سلسلے میں کوئی بات نہ کر دے۔ بہرحال ایک بات تو طے ہے کہ پیٹسوروکوس (Patsoroukos) کی مانند وہ بھی بائیوآٹی (Boiati) جیل سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا!'' ''مسٹر پانا گاولس، مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔ یہ ناقابلِ فہم ہے! مطلقاً ناقابلِ یقین!'' ''جنرل صاحب، مجھے آپ سے اتفاق ہے اور مجھے اس امر پر خوشی ہے کہ اِس حقیقت کا اعتراف صرف میں نے آپ کے سامنے کیا ہے۔ اس لیے کہ آپ ایک شائستہ اور مہذب شخص ہو، ایک سچا سپاہی۔ آپ نے میرے ساتھ کبھی بدسلوکی نہیں کی، کبھی بھی نہیں اور آپ اس بات سے بھی واقف ہو کہ میں کسی دوسرے شخص کے سامنے اپنی زبان کبھی نہیں کھولوں گا! بدترین تشدد اور مار پیٹ کے باوجود میں نے اپنی زبان ہمیشہ بند رکھی'' ''میں اچھی طرح جانتا ہوں، مسٹر پانا گاولس، مجھے معلوم ہے، اور میں یہ دل کی گہرائی سے تسلیم کرتا ہوں کہ تم ایک دلیر اور باعزت انسان

ہو۔ لیکن جو باتیں آج تم نے میرے روبرو کی ہیں، یہ تو ایک سکینڈل ہے، ایک ناقابلِ یقین بات!'' ''جناب والا، مجھے یہ معلوم ہے اور آپ کا تذبذب بھی بجا ہے۔ لیکن یہی ایک سچ ہے۔ ایک بے حد سادہ سچائی۔ ذرا چشم تصور میں لائیے کہ جب اُس دیوار میں وہ سوراخ ابھی ناہموار اور چھوٹا سا تھا، تب زاکاراکس (Zakarakis) میرے پاس خود آتا اور مجھے حوصلہ دیتا: ''ایک بار پھر کوشش کرو، آلیکاس، مسلسل کوشش کرتے رہو، تمہیں ضرور کامیابی ہوگی! اور میں تمہیں ایک کلہاڑی بھی لا دوں گا! اور ایک دن جب میں تھکن سے بے حال تھا اور مزید کوشش کرنے کے قطعاً قابل نہ رہا تھا تو وہ شاید غصے میں آ گیا، اور مجھے کہا: ''آلیکاس، یقیناً تمہیں مجھ سے یہ توقع تو نہ ہوگی کہ یہ سارا کام تمہاری بجائے میں خود کروں!'' لیکن اس ساری تقریر کے باوجود اُس نے میری مدد کے لیے اپنے مسلح محافظ بھیجے، تاکہ پیٹسوروکوس (Patsourokos) کی مانند وہ بھی اس دوزخ سے نکل سکے، اور اُس نے فوجی افسران بالخصوص آپ کے بارے میں جو نازیبا کلمات ادا کیے، وہ میرے زبان دوہرانے سے قاصر ہے، جنرل یہ بات آپ کے ذہن میں ہونی چاہیے کہ میں فوجی جنتا کی چاکر فوج کے بارے میں یہ بات نہیں کر رہا، فوجی آمریت کے اِن چاکروں سے میں پورے دل کی گہرائیوں سے شدید نفرت کرتا ہوں: دراصل میری مراد آپ جیسے سچے سپاہیوں سے ہے، جنرل، جو ملکی سیاست میں ملوث نہیں ہوتے اور اپنا دھیان صرف ملک کے دفاع اور پیشہ ورانہ فرائض کی طرف رکھتے ہیں!'' ''شکریہ آلیکاس، مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تم ایک عادل اور قابلِ احترام دشمن ہو، لیکن تم اس بات کو ضرور جانتے ہوگے کہ میں اِس اطلاع کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں کر سکتا، مجھے بہرحال اسے رپورٹ کرنا ہوگا'' ''سنو جنرل، مجھے معلوم ہے کہ میں ہی اُس کا پورا خمیازہ بھگتوں گا، لیکن خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، تم بے شک، اسے اسی طرح رپورٹ کر دو'' ''اچھا تو آلیکاس، خدا حافظ۔'' ''خدا حافظ جنرل،'' ''پانا گاولس، میں تمہیں ابھی کھانے کے لیے چیچ فراہم کرتا ہوں۔'' ''بے حد شکریہ جنرل،'' ''اور براہِ کرم کچھ نہ کچھ ضرور کھالو۔'' ''ٹھیک ہے جنرل۔''

اُس نے اپنے ہاتھ کو فوجی ٹوپی تک لے جا کر تمہیں یوں سیلوٹ کیا، جیسے تم ہی اُس کے افسر بالا ہو، اور وہ ایک ملول برہمی کی گرفت میں وہاں سے رخصت ہوا۔ چند منٹوں کے بعد اُس نے سارا معاملہ جنرل آئیونیندیز کے گوش گزار کیا اور اُس نے انتہائی برہمی کی کیفیت میں فوراً تھیوفلیوانکوس کو طلب کیا: ''اچھا تو تمہیں یقین ہے کہ دیوار میں وہ سوراخ اُس چیچ کی مدد سے کیا گیا!'' ''جی حضور! اُس بدمعاش نے خود بھی یہی اعتراف ہے،'' ''شوربہ پینے کے عام چیچ کی مدد سے۔'' ''جی سر، اَب ہم سب کو اس بات پر پورا یقین ہے۔'' ''اور کسی شخص نے اُس کی مدد نہیں کی، مثلاً کسی اور ملازم نے اُسے کلہاڑی یا کوئی فراہم نہیں کی۔'' ''نہیں سر، وہ ایک وحشی جانور ہے اور اس امر سے ہم سب واقف ہیں۔'' ''اور تم ایک احمق ہو! ایک مسخرا، ایک نااہل مسخرا، پیچھے!'' ''جی سر!'' ''ایک کو دن! ایک عقل سے عاری تفتیش کنندہ، ایک غلیظ اور حقیر کیڑا!'' ''جی سر!'' ''میری نظروں سے دور ہو جاؤ، ورنہ تمہارے چوتڑوں پر ایسی

لات رسید کروں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔'' دریں اثنا وہ فوجی محافظین، جنہوں نے فرار کی اُس رات تمہارا اٹھٹھہ اُڑایا تھا، کوگاؤڈی (Goudi) کے کیمپ میں لایا گیا۔ اور انہیں جن کمروں میں رکھا گیا، وہ تمہارے قریب ہی واقع تھے اور وہاں سے تم اُن کی شدید دھنائی کے دوران اور بعد کی دردناک چیخیں اور آہ و بکا سُن سکتے تھے اور یہ سب کچھ تمہارے لیے بربط کی موسیقی سے بھی کہیں زیادہ پُر لطف تھا۔ ''نہیں، ہائے، نہیں، المدد، نہیں، میری میا نہیں، میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں، قسم خداوند یسوع کی، میں بَرِ دوش ہوں! ہائے، نہیں اُف نہیں، میں نے اُس کی کوئی مدد نہیں کی، ہائے مجھے اَب نہ ماریں، میں نے کچھ نہیں، ہائے میری میا، خدارا، بہت درد ہو رہا ہے۔ بہت درد ہو رہا ہے، براہِ کرم، بس اور نہ ماریں!'' اُن میں سے کچھ محافظین کو تصدیق کے لیے تمہارے سامنے لائے۔ وہ اس قدر خراب اور خستہ حالت میں تھے کہ ایک لمحہ کے لیے تمہارا دل بھی پسیج گیا، اور تم نے سوچا کہ اِن کی جان بخشی کرا دی جائے لیکن اُس شر مساری اور خجالت کی تلخ یادیں، جنہوں نے تمہارے چہرے کو راکھ کر دیا تھا، ابھی تمہارے ذہن میں تازہ تھیں، لہٰذا ایک انتقامی جذبے کے تحت تم نے جنرل گزیکس (Gizikis) کے سامنے کیے گئے اعترافات کی روشنی میں اُن پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی، بلکہ اُس پر ایک اور گہرا گھاؤ لگایا: ''جی ہاں، یہی وہ لوگ تھے، جنہیں زاکاراکس (Zakarakis) نے کلہاڑی مہیا کی تھی۔ انہوں نے ہی دیوار میں سوراخ کرنے میں میری مدد کی تھی اور پھر وہاں سے کوڑا کرکٹ اور ملبہ بھی اُٹھا کر لے گئے تھے، تاکہ اسے ٹائلٹ سیٹ میں بہانے سے کہیں گٹر ہی بند نہ ہو جائے۔'' ''نہیں یہ جھوٹ بول رہا ہے، یہ صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہا ہے!'' ''اور چونکہ یہ کام کاج میں بہت سست ہے حتیٰ کہ زاکاراکس (Zakarakis) بھی اپنے تمام تر اختیارات اور خواہش کے باوجود انہیں تیزی سے وہاں سے ملبہ ہٹانے پر مجبور نہ کر سکا، لہٰذا زاکاراکس کی خواہش پر ایک وقت میں نے وہ کوڑ کباڑ اور ملبہ ٹائلٹ میں ڈال دیا جس سے گٹر بند ہو گیا۔ اس سے وہ اس قدر برافروختہ ہوئے کہ کسی صورت گٹر کو کھولنے کے لیے تیار نہ تھے۔'' تمہاری زاکاراکس (Zakarakis) سے براہِ راست ملاقات نہ ہوئی اور جنرل آئیونیڈیز (Ioaniddis) نے بنفسِ نفیس اس سارے معاملے کی چھان بین کی اور امر واقعہ ہے کہ اُسے تمہارے بیان پر کچھ نہ کچھ شکوک ضرور تھے۔ دراصل وہ باقی لوگوں کے مقابلے میں تمہیں بہتر طور پر سمجھتا تھا۔ مثلاً اُسے پتہ تھا کہ تم کوئی بھی کارنامہ سرانجام دینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے: حتیٰ کہ جیل سے اس فرار کے کارنامہ کی ساکھ کو بھی داؤ پر لگانے تمہیں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو سکتی تھی، اور یہ کہ صرف زاکاراکس (Zakarakis) کو مشکلات میں ڈالنے کی خاطر دروغ گوئی سے بھی کام لے سکتے تھے لیکن اُس کے جملہ شکوک و شبہات ایک مخصوص استدلال پر مبنی تھے اور اُس نے اِس معاملے کا جس زاویے سے بھی جائزہ لیا۔ اُسے اپنی یہ منطق صحیح، جامع اور مکمل لگی۔ فرض کیا زاکاراکس کو یہاں سے ہٹا دیا جائے؟ مگر کیوں؟ اگر تم نے اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے، تو کوئی جیلر، زاکاراکس سے زیادہ قابلِ اعتبار اور کم از کم تمہارے معاملے کی حد غیر لچکدار نہیں ہوگا۔ لیکن اس

کے برعکس اگر تمہارا بیان سچ پر مبنی ہے؛ تو بلاشبہ زاکاراکس کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے۔ لیکن اگر یہ سزا اُس کی توقع کی مطابقت میں ہو تو یہ ایک من چاہا صلہ ہوگا۔ لہٰذا تمام پوچھ گچھ اور ملامت و دشنام بے کار تھی؛ بس ہلکی پھلکی سرزنش ہی کافی ہوگی۔ جنرل نے اُسے طلب کیا: ''زاکاراکس، پنشن پر جانا چاہتے ہو؟'' ''جنرل صاحب، میں سمجھا نہیں۔'' ''تم سب سمجھتے ہو، زاکاراکس، زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو، تم سب سمجھتے ہو۔ وہ شخص جس نے آج تک اپنی زبان بند رکھی، اس بار اُس نے بولا ہے۔ مجھے سب کچھ پتہ ہے۔ اَب تم یہ ناٹک بند کر سکتے ہو۔'' ''جنرل صاحب، سر، مجھے ایک بار یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ میں کچھ نہیں سمجھا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ میں کچھ تھک گیا ہوں؛ آپ خود تصور کیجیے کہ میں گذشتہ پانچ مہینے سے اس ڈھیٹ، ذلیل، بدبخت اور عادی مجرم کے ساتھ گزارا کر رہا ہوں۔ یہ بھی درست ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا یہاں سے تبادلہ کر دیا جائے، کیونکہ نہ تو میں اس کی منحوس شکل دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ ہی اُس کی مکروہ آواز سننا چاہتا ہوں۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ میرے ذہن سے یہ امر بھی محو ہو جائے، کہ اس دنیا میں اس کا بھی وجود ہے۔ لیکن ریٹائرمنٹ؟ نہیں سر، نہیں، بالکل نہیں!'' ''تبادلہ، زاکاراکس؟ کیا یہ لفظ تم نے بولا اور میں نے درست سُنا؟ تم نے خود یہ کہا کہ تم یہاں سے تبادلہ چاہتے ہو؟'' ''جی سر، بالکل، جنرل صاحب، اگر یہ ممکن ہو تو بالکل ہاں۔ جنابِ والا، اِن حالات میں میرا یہاں رہنا بے حد مشکل ہے۔ یہ ایک عفریت اور شیطانی عفریت ہے، یقین مانیے سر یہ انسان نہیں بلکہ ایک شیطان ہے!'' جنرل آئیونیڈیز کا لہجہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ سرد ہو گیا۔ ''زاکاراکس میں اُسے تم سے بہتر جانتا ہوں۔ یہاں تک تو تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ وہ ایک ابلیس ہے۔ لیکن وہ ایک راست گو اور دیانتدار شخص ہے۔ اُس کے برعکس تم ایک احمق ہو اور حد درجہ بددیانت بھی۔ اُصولی طور پر تو مجھے گرفتار کر لینا چاہیے تھا اور غداری کے الزام میں تمہارا کورٹ مارشل کرنا چاہیے تھا۔ لیکن تمہارے لیے یہ تو کوئی سزا نہیں ہوتی، بلکہ ایک من چاہا تحفہ ہوتا اور ___'' ''کورٹ مارشل؟ غداری؟ جنرل صاحب، حضورِ والا، جنابِ عالی، میں نے ہی تو اس عادی مجرم کو جیل سے فرار ہوتے ہوئے گرفتار کیا، جنابِ والا میں ہی تو وہ شخص ہوں جس نے ___'' ''زاکاراکس، بکواس بند کرو، اور جب میں بول رہا ہوں تو بیچ میں مت بولا کرو۔ اور میں اس بات کو پھر دوہراتا ہوں کہ تمہارے ایسے گھٹیا ملازم کے لیے کورٹ مارشل کوئی سزا نہیں، بلکہ ایک بیش قیمت تحفہ اور مجھے معلوم ہے کہ تم کس سزا کے مستحق ہو۔ اور تم جانتے ہو کہ میں تمہیں کیا سزا دینے والا ہوں؟ تم اُس کے ساتھ اسی بائیو آٹی جیل میں اپنے اسی عہد پر بدستور قائم رہو گے! اور میں حلفاً کہتا ہوں کہ جب تک وہ زندہ رہے، تمہاری پیٹھ پر سواری کرتا رہے گا۔ تم اور وہ ہمیشہ لازم و ملزوم رہو گے!'' ''نہیں جنرل نہیں، رحم جنرل، رحم، خدارا یہ نہ کیجیے حضور!'' ''یہ تو خیر ہوگا ہی، میں عین اسی لمحے تمہیں ایک اور کام بھی تفویض کر رہا ہوں اور پوری توجہ سے سنو، تم اُس کے لیے ایک خصوصی سیل تعمیر کراؤ گے، ایک ایسا سیل جہاں سے وہ کسی صورت فرار نہ ہو سکے، چاہے تو خود ہی اُس کے سیل کا دروازہ کیوں نہ کھول دو، اور اَب یہاں سے

اپنی منحوس شکل لے کر دفع ہو جاؤ۔ حد درجہ محتاط رہو، کیونکہ اَب تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں، اگر اس بار تم ناکام ہوئے تو میں تمہیں کورٹ مارشل سے بھی بڑی سزا دوں گا۔ میں تمہیں اُس کے ساتھ ایک ہی سیل میں قید کروں گا!''

اگلے دو ہفتے زاکاراکس (Zakarakis) ایک سایے کی مانند بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جنرل آئیونیڈیز (Ioianiddis) کی سخت ڈانٹ ڈپٹ نے اُسے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا اور اُس نے اپنے کمزور لمحات میں تمہارے آگے اعتراف کیا کہ وہ وظائف زوجیت ادا کرنے کے بھی قابل نہ رہا، مباشرت کا عمل اُس کے لیے عذاب بن گیا، اُس کی بیوی اُس پر طنز کے تیر برساتی رہی اور اُس کا ٹھٹھہ اُڑاتی رہی، مگر اُس سے کچھ نہ ہو سکا: ''یوں لگتا تھا کہ انہوں نے اُسے ایک پارتھنون (Parthenon) مندر [ایتھنا دیوی کا مندر جو ۵۰۰ قبل از مسیح ایتھنز میں تعمیر کیا گیا، اور جو اپنی مضبوطی کے لیے مشہور ہے] کی تعمیر پر معمور کر دیا ہے۔ ایک اُمید شکن مجہولیت نے اُس میں ہر طرح کی مردانہ اور غیر مردانہ کمزوری پیدا کر دی تھی اور اپنی نااہلیت کی بے بس آگہی سے صرف اُسے تب نجات ملتی، جب وہ کسی ایسے سیل کی تعمیر کا خواب دیکھتا، جس سے تم کبھی فرار نہ ہو پاؤ۔ لیکن ایسا سیل کس طرح کا ہوگا اور کیونکر بنے گا؟! یہ ایک ایسا گھمبیر مسئلہ تھا، جس نے اُس کی جنسی صلاحیت، بھوک اور راتوں کی نیند، سب کچھ اُڑا کر رکھا دیا تھا لیکن جنرل آئیونیڈیو نے اُسے اس طرح کے انوکھے سیل کی تعمیر کی تمام تر ذمہ داری سونپ دی تھی!'' کان کھول کر سنو زاکاراکس، یہ سیل کیسے اور کیونکر بنے گا؟ یہ صرف تمہارا دردِ سر ہے، میں تمہیں صرف تین ماہ کی مدت کی مہلت دے رہا ہوں۔ کرسمس کے بعد اُسے ہر صورت تیار ہونا چاہیے۔'' کرسمس کے فوراً بعد! صرف تین ماہ! اس گھمبیر مسئلہ کے حل کی تلاش میں، اُس نے تعمیرات پر اَن گنت کُتب، رسائل اور کیٹلاگ کھنگالے، میکس ول (Maxwell) کی مساوات، دباؤ کی مزاحمت، تقابل بالقوت اور بیٹی (Betti) کے فارمولا جیسے مشکل نظریات پر بے سود مغز ماری کی۔ بہر حال اگر ایسا سیل تعمیر کیا جائے تو اس کی بنیادوں کو مضبوط رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کنکریٹ ڈالنا ہوگا، اس کی دیواروں کی موٹائی اتنی زیادہ ہو کر مضبوط ترین اور تیز سے تیز برمے کی مدد سے بھی اس میں شگاف تک نہ ڈالا جا سکے اور ٹھوس سٹیل کے دو دروازے ہونے چاہئیں، اور کھڑکیاں ایسی، جو دکھائی ہی نہ دیں اور چھت میں اتنی تیز برقی رو ڈالی جائے کہ اگر تم اوپر دیکھنے کی جسارت کرو تو ایک جھٹکا کھا کر فرش پر جا گرو۔ لیکن وہ محسوس کر سکتا تھا کہ یہ سب پیش بندیاں بھی تمہیں قابو کرنے کے لیے کافی نہ ہوں گی۔ کسی اور بہتر حکمت عملی کی ضرورت تھی، کوئی نیا حربہ، کوئی ایسی صورت نکالنے کی ضرورت تھی، جو محض تمہارے وجود کو ہی قید نہ کرے، بلکہ تمہارے تخیل تک کو مسل دے۔ کوئی ایسی شے جو تمہارے دماغ کو ماؤف کر دے۔ اس کے ڈنگر دماغ میں کسی طور یہ خیال سما گیا تھا کہ اگر تمہارے دماغ کو سوچنے کے مواقع سے محروم کر دیا جائے تو تمہیں قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ مگر کیسے، جب تک کہ ایک بالکل نئی ترکیب کو نہ آزمایا جائے، تم دیوار میں سوراخ کرنے سے نہ باز

آؤ گے اور خدانخواستہ اگر تم جیل سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے، او خداوند! رحم، کیونکہ جنرل آئیونیڈیز تو قطعاً رحم نہ کھائے گا: ''زاکاراکس، تمہیں اَب بہت زیادہ احتیاط اور پیش بندی سے کام لینے کی ضرورت ہے! اگر اس بار تم ناکام ہوئے تو میں تمہیں کورٹ مارشل سے بھی زیادہ سنگین سزا دوں گا۔ میں تمہیں اُس کے ساتھ ایک ہی سیل میں عمر بھر کے لیے بند کر دوں گا!'' پھر ایک دن، نومبر کے اواخر جب وہ ایک قبرستان میں مڑگشت کر رہا تھا تو وہاں اس نے ایک چیپل نما مقبرہ دیکھا، اور اُسے وہ مطلوبہ خیال مل گیا: ایک مقبرہ! اس بلا کا یہی ایک علاج ہے؛ جیتے جی ایک قبر! ایک ایسا سیل جس کی تمام پیمائشیں، جہتیں اور شکل قبر جیسی ہو۔ ہاں وہ تمہارے لیے ایک مقبرہ تعمیر کرے گا اور اُس کے ساتھ سوگ کی علامت کے طور پر ایک چھوٹا سا سرو کا پودا بھی ہوگا۔ ویسے تو جیل کے بڑے مرکزی صحن میں سرو کا ایک درخت پہلے سے ہی موجود تھا۔ جیسے ایک فنکار یا شاعر اپنی آمد پر فوراً عمل نہ کرے تو اُسے اپنی تخلیقی رو کے کھونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے، ویسے ہی زاکاراکس فی الفور بوئیاٹی (Boiati) واپس آیا، مقبرے کا نقشہ بنا کر اُس کی پیمائشوں کو متعین کیا۔ دو ماہ بعد مقبرہ نما سیل تیار تھا۔ وہ دہشت ناک سیل جہاں تمہیں جیل کے ساڑھے تین برس بِتانے تھے، اور طویل قید کا سلسلہ جو فروری کی ایک صبح کو شروع ہوا تھا۔

فروری کی وہ خوفناک صبح، تب تم گاوڈی (Goudi) جیل میں بند تھے، اور تمہارے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ زاکاراکس (Zakarakis) پارتھنون کی تعمیر کا محیر العقول کارنامہ سر انجام دے چکا تھا۔ تمہیں یہی گمان رہا کہ اَب تمہیں اُس کی بجائے کسی اور کی نگرانی میں دیا جا رہا ہے۔ ویسے گاوڈی میں اَب تمہارے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہ روا رکھا جا رہا تھا۔ یہاں کے کمانڈنٹ نے تمہیں اتنا عرصہ قطعاً ہتھکڑی نہ لگائی۔ یہاں کے محافظین اکثر تمہارے ساتھ گپ شپ لگاتے رہتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہیں یہاں ایک اور موراکس (Morakis) مل گیا تھا! یہ بھی ایک فوجی سپاہی تھا جو تمہیں فرار کے نئے منصوبے میں ہر طرح کی مدد دینے کے لیے تیار تھا۔ ''میری جانب دیکھو، آلیکاس، کیا تم نہیں پہچان پائے؟'' ''نہیں'' ''لیکن تم مجھے جانتے ہو، اور تم نے مجھے اس سے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے، ذرا یاد تو کرو۔'' ''کہاں؟ اور کب؟'' ''ای۔ایس۔اے کے ہیڈ کوارٹر میں، اُس وقت تمہیں گرفتار کر کے وہاں لایا گیا تھا، اور پھر تم پر ایک تشدد کے دوران'' ''مجھ پر تشدد کے دوران؟'' ''ہاں، انہوں نے مجھے تمہیں پیٹنے کا حکم دیا تھا۔ اور میں نے ایک آہنی ڈنڈے کے ذریعے تمہیں مارا تھا، لیکن بعد میں مجھے اس پر بے حد خجالت اور شرمندگی ہوئی۔'' ''مجھے تم پر قطعاً یقین نہیں۔'' مگر یہ سچ ہے، میرے دوست آلیکاس، بالکل سچ، اور اُس کے بعد مجھے شدید ندامت کا احساس ہوا اور میں نے قسم کھائی کہ میں اولین موقع ملتے ہی تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا اور ___ ''مجھے تم پر قطعاً بھروسہ نہیں۔'' ''مجھ پر اعتماد کرو آلیکاس، میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا، اور تب میں نے اپنے آپ سے کہا تھا، کہ اگر انہوں نے مجھے خود ہی ہلاک نہ کر دیا تو ایک دن میں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔'' ''نوجوان عقل کے ناخن لو، تمہیں

پتہ ہے کہ موراکس کو سولہ برس قید سخت کی سزا ہوئی ہے۔'' ''جی، مجھے پورا علم ہے۔'' ''اور تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ اگلی بار وہ مجھے گرفتار کرنے کی زحمت گوارہ نہ کریں گے، بلکہ مجھے اور میرے ساتھ جو کوئی بھی ہوگا اُسے گولی مار کر ہلاک کر دیں گے۔'' ''میں جانتا ہوں؟ تم کیا جانتے ہو، احمق مسخرے؟'' اپنے آزمودہ کلیے کو استعمال میں لاتے ہوئے، تم نے اُس کا ٹھٹھا اُڑایا، حسبِ معمول دھمکایا اور شرمسار کیا، لیکن آخر کار تم دل سے قائل ہو گئے کہ وہ تم سے کسی طرح غلط بیانی سے کام نہ لے رہا تھا، اور تم دونوں نے باہمی مشاورت سے ایک منصوبہ تیار کیا۔ اس بار کسی حماقت کا مظاہرہ نہیں کیا جائے اور نہ ہی غیر ضروری مہم جوئی سے کام لیا جائے گا۔ وردی کے علاوہ وہ تمہیں گاوڈی (Goudi) جیل سے نکلنے کے لیے ضروری فوجی دستاویزات فراہم کرے گا، ایک جعلی پاسپورٹ، تمہارے خدوخال میں مناسب تبدیلی کے لیے ایک عدد سیاہ چشمہ، اور جیل سے باہر ایک کار تمہاری منتظر ہوگی اور وولیا جیمنی (Vooliagmeni) کی بندرگاہ پر تمہیں ایک کشتی تیار حالت میں ملے گی، جو تمہیں ملک سے باہر لے جائے گی۔ اس منصوبہ میں واحد بڑی رُکاوٹ تمہارے سیل پر لگے دو انتہائی مضبوط تالے تھے، جن کی کنجیاں ایک فوجی کیپٹن کی تحویل میں تھیں۔

''آلیکاس، یہ کنجیاں میں اُس سے کسی صورت چرا سکتا۔'' ''خیر اس کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں، تم بازار میں تالوں کے کسی کاریگر کے پاس جاؤ اور اُس سے ایسی چابیاں خرید لو، جو تمہارے خیال میں کام آ سکتی ہیں۔ وہ حسبِ ہدایت بازار گیا اور جب واپس آیا تو اُس کے پاس قریب قریب پچاس کنجیاں تھیں۔ اُن میں سے ایک چابی سے ایک تالا تو کھل گیا، مگر دوسرا تالا نہ کھل سکا۔ ''آلیکاس، اَب کیا ہوگا؟'' ''سادہ سی بات ہے، دوست، کچھ اور چابیاں خرید لاؤ، بلکہ مارکیٹ میں موجود ہر طرح کی کنجی خرید لو۔ اگر ہم مسلسل کوشش کرتے رہے، تو بالآخر ہمیں مطلوب کنجی ضرور مل جائے گی۔'' وہ پھر بازار گیا اور تقریباً سو کنجیاں لے آیا۔ اُس کے روزانہ ڈیوٹی کے اوقات صبح آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک اور رات دس بجے سے ایک بجے تک تھے۔ اس عرصہ میں وہ کسی بھی وقت پکڑے جانے کے خوف کے ساتھ، لرزتے، کانپتے اور پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے دوسرے تالے کو کسی کنجی کے ساتھ کھولنے کی کوشش کرتا رہا۔ ''ارے اس کنجی کو آزما کر دیکھو'' ''نہیں یہ تو کام نہیں کر رہی'' آخر کار ایک ایک کر کے اڑتیسویں کنجی سے تالا کھل گیا۔ ''شاباش، آفرین میرے شیر، کیا کام دکھایا ہے۔ اچھا تو کیا تم کل کے لیے سارے بندوبست کر لو گے؟'' ''جی بالکل، سارا انتظام مکمل ہے اور وہ کئی دنوں سے تمہارے منتظر ہیں'' ''تو نصف شب، کل ملاقات ہوگئی۔''

نصف شب ہی مناسب وقت تھا کیونکہ اُس وقت سارا کیمپ گہری نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

اُس صبح تم نے فلش ٹائلٹ میں ملبہ بہانے والے دنوں کی مانند کھل کر گیت گائے۔ لیکن تمہاری موسیقی زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی۔ کیونکہ ٹھیک نو بجے ایک سکواڈ تمہارے سیل میں داخل ہوا ''آلیکاس، باہر آؤ، تمہیں یہاں سے لے جانے کا حکم آ گیا ہے۔'' ''لے جانے کا حکم؟ مگر کہاں؟'' ''بائیوآٹی، تمہیں واپس بائیوآٹی بھیجا جا رہا ہے۔'' ایک ٹرک، ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سفر، تمہارے من میں رونے کی ایک

ایسی تحریک پیدا ہوئی، جس نے تمہارے سانسوں کو گھونٹ دیا، اور وہاں بوئیوآٹی کی بیرونی دیوار اور میناروں کے ساتھ دور تلک ایک خاکستری منظر پھیلا تھا۔ زاکاراکس اپنے ہاتھوں کو کولھوں پر دھرے جیل کے داخلہ پر تمہارا منتظر تھا۔ اُس کا روکھا پھیکا چہرہ بمشکل ہی اپنی فتح عظیم کے تاثرات کو چھپا سکتا تھا!

''صدقے جاؤں، دیکھو تو یہاں کون آیا ہے، آؤ سبھی دیکھو کہ یہاں کون لوٹا ہے! آؤ، آؤ، میرے پیارے بچے، اندر تو آؤ، تمہارے تو خواب میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ جب تم گاوڈی (Goudi) میں چھٹیاں منا رہے تھے، تو میں نے تمہارے لیے کیا انمول تحفہ تیار کیا ہے۔'' اُس نے تمہارے بازو کو اپنی گرفت میں لیا اور اُس چھوٹی سڑک پر تمہیں دھکیلتا چلا گیا، جو بڑے صحن سے گزرتی ہوئی اُس سیل تک جاتی تھی، جہاں سے تم فرار ہوئے تھے۔ لیکن وہ اِس سیل پر رُکے بغیر آگے چلا، وہ پہلے دائیں مڑا، پھر بائیں، ایک بار پھر وہ دائیں مڑا، اور تمہارا دل ایک پاگل تندی میں دھڑکا: تمہاری چھٹی حس نے تمہیں بتایا کہ اَب بہت ہی بُرا واقعہ ہونے والا ہے اور جب زاکاراکس نے کہا: ''ہم یہاں پہنچ ہی گئے، میرے پیارے بالک، لو ہم اپنی منزلِ مقصود تک آن پہنچے ہیں'' تمہیں ایک شدید دہشت و ہراس کا تجربہ ہوا، اس میں کوئی ایسی شے تھی جس نے تمہاری ساری سہی اذیتوں کو مات کر دیا تھا۔ ''لو میری جان، ہم ادھر آن پہنچے ہیں، عزیز من دیکھو تو سہی یہ جگہ! کیا یہ تمہیں خوش آئی؟ یہ تمہارے لیے ہے سب کا سب صرف تمہارے لیے ہاں صرف تمہاری خاطر!'' اور ایک کھلی جگہ کے وسط میں وہ تمہارے آگے یوں ظاہر ہوئی کہ جیسے کسی نے تمہاری آنکھ پر ایک زبردست گھونسہ رسید کر دیا ہو، ایک قبر، جس کے ساتھ ایک سرو کا پودا تھا۔ ''سرو کا یہ پودا ابھی چھوٹا ہے، لیکن فکر کی ضرورت نہیں، وقت کے ساتھ یہ بھی بڑا ہو جائے گا۔''

تم کہا کرتے تھے کہ ایسے سیل کو چشمِ تصور میں بھی لانا محال ہے جب تک آپ نے خود اسے نہ دیکھا ہو اور یہی وجہ ہے کہ فوجی جنتا کا تختہ اُلٹنے کے بعد تم نے وزیرِ دفاع ایونجلوس ٹوسٹساس (Evangelos Tossitsas) سے درخواست کی کہ تمہیں اس سیل کی تصویر بنانے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اُس نے تمہاری درخواست کو مسترد کر دیا۔ جب تم پارلیمنٹ کے رُکن منتخب ہوئے تو ایک بار پھر تم نے درخواست کرتے ہوئے یہ وضاحت بھی کی کہ یہ تمہارے کسی نفسیاتی خبط کا مسئلہ نہ تھا بلکہ پوری مہذب دنیا کو یہ بتانا مقصود تھا کہ فوجی آمریتوں میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن ایک بار پھر اُس نے تمہیں یہ اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ تم ایک ضد کے ساتھ مسلسل اُسے یہ اجازت دینے کے لیے کہتے رہے۔ اور ہر بار جب وہ تمہاری درخواست کو مسترد کرتا، تو اُس کے بارے میں تمہارا گمان یہی ہوتا کہ وہ مہذب دنیا کے منفی اور جارحانہ ردِعمل کے خوف سے اس امر واقعہ کو چھپانا چاہتا ہے اور اسی لیے اس جیل اور مقبرہ منہدم کر کے اسے یونان کی تاریخ سے حرف کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے تو اُس نے تمہیں بوئیوآٹی (Boiati) جیل کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا اور تم اُس پر ایک نگاہ ڈال کر خود سے یہ نہ کہہ سکے ___ یہاں مجھے اتنے عرصہ زندہ دفن رکھا، مگر میں پھر زندہ سلامت بچ گیا، ہاں بالآخر

میری جیت ہوئی؛ تم نے اس قبر کو پھر کبھی نہ دیکھا اور نہ تم اُس کی تصویر بنا سکے۔ لیکن نشانات کی تلاش میں یہاں ایک یاتری کی طرح آئی۔ وہ گلیاں اور گھر جن میں سے بیشتر اَب مٹ چکے تھے، تمہارے موت کے بعد اُن دِنوں جب میں کھوئے ہوئے ماضی کے، کنکریٹ کے ٹوٹے ہوئے ستون، تند ہواؤں کی زد میں آئے ہوئے آہنی جالے، میں نے ایک بار انہیں تمہاری خاطر دیکھا، اور تمہاری یاد میں اُن کی تصویریں بنائیں۔ اس وقت وزیر دفاع ایونجلوس ٹوسٹساس (Evangelos Tossitsas) کے بلڈوزر اُسے مسمار کر رہے تھے۔ بیرونی دیوار کے بیشتر حصّے اور مینار منہدم ہو چکے تھے، مرکزی بیریکس اور ہر شے ریزہ ریزہ ہو کر نا موجود میں تبدیل ہو رہی تھی، اسی لیے مجھے اُس صحن کو شناخت کرنے میں بہت دقت پیش آئی، جہاں اُس شرمساری والے دِن، انہوں نے تمہیں فٹ بال کھیلنے پر مجبور کیا تھا۔ زاکاراکس (Zakarakis) کا دفتر، وہ سیل جہاں سے تم موراکس (Morakis) کے ہمراہ فرار ہوئے اور جہاں لوٹ کر تم نے فلش ٹائلٹ کی جنگ لڑی۔ میں نے اُس سیل کو بھی شناخت کر لیا کیونکہ اُس کی دیوار میں اندرونی جانب اُس سوراخ کے نشانات موجود تھے، اور باہر سے بھی اُس دیوار میں لگے جوڑ سے اُسے پہچانا جا سکتا تھا۔ پھر میں اُس وسیع دالان تک پہنچی جیسے زاکاراکس نے اپنے پارتھنون (Parthenon) کی تعمیر کے لیے منتخب کیا تھا۔ اُس کی ایک جھلک نے ہی میرے دل کی دھڑکنوں کو بند کر دیا تھا، اس لیے میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ واقعتاً ایک قبر تھی، اور تم نے زیبِ داستان کے لیے قطعاً اُسے بڑھا چڑھا کر نہ پیش کیا تھا۔ اس کا ظاہر نقشہ، تناسب اور رنگ سب کچھ ایک قبر کی مانند تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی، جس کی پیمائش بمشکل تیس ضرب تیس سینٹی میٹر تھی۔ واحد شے جس سے سیمنٹ کی یکسانیت مجروح ہوتی تھی، ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو سیل کی ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ اندرونی صورتحال اس سے بھی کہیں بدتر تھی کیونکہ جلد ہی تمہیں یہ محسوس ہو گیا کہ وہاں ہر شے اس سے کہیں چھوٹی تھی کہ جتنی وہ باہر سے نظر آتی تھی: کل جگہ کا دو تہائی حصہ تو ڈیوڑھی نے ہی گھیر رکھا تھا۔ اصل سیل، ڈیوڑھی کے پیچھے ایک آہنی سِل پر مشتمل رُکاوٹ کے عقب میں واقع تھا جو بمشکل تمہاری ٹھوڑی تک آتی تھی۔ اندرونی سیل کا رقبہ بمشکل دو ضرب تین میٹر پر مشتمل تھا۔ اُس کی پیمائش ایک ڈبل بیڈ کے برابر یا اُس سے ذرا زیادہ تھی۔ اس کے باوجود یہ موازنہ اس لیے صریحاً غلط تھا کیونکہ اس سے تاثر پیدا ہوتا کہ وہاں تمہیں حرکت کرنے کے لیے ڈبل بیڈ جتنا رقبہ میسر تھا، حالانکہ وہاں تمہیں چلنے پھرنے کے لیے محض ایک میٹر اَسی سینٹی میٹر طویل اور نوے سینٹی میٹر چوڑی پٹی دستیاب تھی۔ باقی رقبہ میں ایک چارپائی، برتنوں کے لیے ایک الماری، ایک ادنیٰ سی بیسن نما شے اور ایک ٹائلٹ تھا۔ چارپائی کے فرش سے پچاس سینٹی میٹر کے فاصلے پر فکس کیا گیا تھا اور مزید یہ کہ اسے الماری اور سیل کی دوسری دیوار کے کونوں کے درمیان اس طرح رکھا گیا تھا کہ جب تم بستر پر پاؤں پھیلا کر لیٹنے کی کوشش کرو تو مکمل تاریکی اور انتہائی نیچی چھت میں تمہیں یہی محسوس ہو کہ تم ایک قبر میں لیٹے ہو۔ سیل میں زیرو نمبر کے نیلے بلب کے علاوہ جو کبھی کبھی جلتا تھا، ڈیوڑھی سے بھی تھوڑی تھوڑی

روشنی یوں چھن کر آ جاتی تھی کہ وہاں چھت کی بجائے محض اُفقی آہنی سلاخیں لگی تھیں، مگر یہ بھی دن جیسی روشنی یوں نہ تھی کہ اُن آہنی سلاخوں کے اوپر ایک آہنی گرل اور اُس کے اوپر ایک مضبوط جالی تھی۔ اس لیے سورج کی روشنی آہنی جالی سے یوں چھن کر آتی تھی جیسے کسی باریک چھلنی سے گزر کر آ رہی ہو، ایک مدہم تمتماہٹ، ہلکی زردکرنیں، لیکن اس میں سے بارش کا پانی فوراً اندر آ جاتا تھا۔ سردیوں میں یہ سیل اور سرد اور گرمیوں میں یہ اور زیادہ گرم ہو جاتا تھا۔ مختصراً یہ ایک ایسی قبر تھی جو ہر طرح کے عناصر کی زد میں تھی۔ میں نے وہاں خود کو اندر بند کر لیا اور اُس ایک میٹر آہنی سینٹی میٹر طویل اور نوے سینٹی میٹر چوڑی راہداری میں یہ نظم یاد کرتے ہوئے چہل قدمی کی کوشش کی ''قدم بڑھاؤ تین گُل/ پھر ہٹاؤ تین گُل/ ہزار بار اِک وہی سفر/'' آج اس پیدل چلنے نے مجھے تھکا کر رکھ دیا تھا۔'' تین قدم؟ یہاں تو بمشکل دو قدم آگے بڑھ سکتے تھے یا پیچھے ہٹا سکتے تھے۔ میں بھی اُس چارپائی پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی۔ لیکن تنگ دیواروں اور انتہائی نیچی چھت کے کارن میرا سانس گھٹ گیا۔ میں نے اپنا سانس بحال کرنے کے لیے آہنی سلاخوں کا سہارا لیا؛ اور مجھے اپنی اِس خواہش پر قابو پانے میں بہت کوشش کرنا پڑی کہ قبر کے اُس چھوٹے دروازے کو پوری طرح سے کھول دوں اور جب مجھے یہ لگ رہا تھا کہ میں یہاں گھنٹوں کے گھنٹے گزار چکی ہوں، تب میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ کی: اُف خدایا، ابھی بمشکل دس منٹ ہی گزرے تھے۔ میں نے اپنی تمام تر قوتِ ارادی کو کام میں لاتے ہوئے وہاں بدستور لیٹے رہنے کی کوشش کی، لیکن وقت کی دھارا اس قدر آہستہ رو تھی کہ میں سبھی حواس کھو بیٹھی اور اِس موت ایسی سنسناتی خاموشی میں میرا ذہن کوئی قلمی شے بن کر رہ گیا اور موت کے اس سکوت میں صرف ایک خیال باقی رہا؛ نکلو، یہاں سے باہر چلو!

اور تم نے اس سب کے باوجود زاکاراکس پر ایک لمحے کے لیے بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ تم کسی مایوسی یا اضمحلال کا شکار ہوئے ہو؛ تم مسکراتے ہوئے اُس سے سوال جواب کرتے رہے: ''شاباش، آفریں زاکاراکس! کیا یہ کارنامہ تم نے خود سرانجام دیا ہے؟'' ''بالکل آلیکاس، یہ شروع سے آخر تک میرا اپنا خیال تھا جسے میں نے عملی جامہ پہنایا۔'' پر تم تو اتنے کودن ہو، میں اس پر یقین کروں؟'' ''قسم لے لو یار، یہ سب میں نے خود ہی کیا ہے اور اس کا ڈیزائن بھی میں نے ہی تیار کیا تھا!'' ''تب تو ڈھیروں مبارکباد'' پھر تم نے ڈیوڑھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''کیا وہ بھی میری سہولت کے لیے ہے؟'' ''نہیں یہ تو اُن فوجی محافظین کے لیے ہے جو تمہارے لیے کھانا لایا کریں گے۔ لیکن اگر تم نیک چلنی کا وعدہ اور مظاہرہ کرو تو میں تمہیں یہاں نصف گھنٹہ کے لیے چہل قدمی کی اجازت دے سکتا ہوں۔'' ''بہت اچھے بھئی بہت ہی اچھے، کیا بات ہے تمہاری زاکاراکس۔'' ''تم نے مجھے بس اتنا ہی کہا تھا؟'' ''ہاں بس اتنا ہی، لیکن اِن سارے انتظامات کے باوجود میں تمہیں یہاں سے بھاگ کر دکھاؤں گا۔'' ''نہیں تم یہاں سے کسی صورت فرار نہیں ہو سکتے۔'' ''میں یہاں سے نکل جاؤں گا، شرط لگاتے ہو؟'' ''ٹھیک ہے، پر شرط ہو گی کیا؟'' ''ایک کرنل کی وردی'' ''ٹھیک ہے تو پھر لگ گئی۔'' ''اُس نے سیل کا پہلا دروازہ اُٹھایا، پھر

دوسرا دروازہ کھولا اور تمہیں سوچنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ تمہیں طیش میں آئے بغیر اپنے دماغ کو کام میں لانا تھا اور یہ کہ نہ تو تم خود پر ترس کھاؤ، اور نہ ہی اس بنا پر اپنے نصیبوں کو کوسو کہ دوسرے تالے کی چابی تمہیں چوبیس گھنٹے تاخیر سے ملی، جو بیت گئی سو بیت گئی۔ لیکن بہرحال یہاں سے بھی نکال بھاگنے کے مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل تو ضرور ہوگا، اور تم اُسے ضرور دریافت کرلو گے، محض چند دنوں کی ہی تو بات ہے۔ انہی خیالوں میں گم تمہارے پہلے پانچ دن بیت گئے۔ دریں اثنا تم یہاں سے ضروری ضروری معلومات اور تاثرات کو اکٹھا کر کے اُن کی تحلیل و تجزیہ کرتے رہے۔ مقبرہ کے گرد سولہ محافظین متعین تھے، ہر جانب تین مسلح محافظین اور ہر نکر پر ایک محافظ موجود تھا۔ ان میں سے چار تمہارے لیے کھانا لانے کی ڈیوٹی پر معمور تھے۔ یہ سب نئے نئے بھرتی ہوئے اور تم نے ان کی خالی الذہن چہروں کا بغور جائزہ لیا۔ غالباً تمہارے مسئلہ کا حل انہی خالی الذہن چہروں میں پوشیدہ تھا، شاید تمہارے لیے انہیں جُل دینا زیادہ کٹھن نہ ہو اور تمہیں اس سیل سے باہر نکلنے کی صورت مل جائے۔ ویسے تمہارے اپنے خیال میں یہ سیل کوئی ایسی بڑی رُکاوٹ نہ تھا۔ اصل مسئلہ بیرونی دیوار پر لگی خاردار تار کا تھا، کیا یہ وہ اُسی طرح کی عام خاردار تار تھی، جب تم نے موراکس کے ہمراہ اس دیوار کو پھلانگا تھا، یا پھر اَب اس میں تیز برقی رو دوڑ رہی تھی؟ تم اس کے بارے میں محافظین سے پوچھ بھی نہ سکتے تھے، کیونکہ اس طرح کے سوال کا مطلب ''خوامخواہ'' کے شکوک شبہات پیدا کرنا تھا۔ تم صرف جوا کھیل سکتے تھے، اس بار ایک اندھی چال: اگر تمہارا جھٹکا ہو گیا، تو اس کا مطلب ہے کہ اس میں برقی رو دوڑ رہی ہے وگرنہ یہ عام خاردار تار ہے۔ لیکن تمہیں یہ خطرہ اس لیے ضرور مول لینا ہے کیونکہ سیل سے باہر نکلنے کے لیے ایک دلچسپ چال تمہارے تخیل نے منصوبہ بندی اور چھٹے دن تم نے اپنا ذہن تیار کر لیا۔ دھیرے دھیرے گزرتی ہوئی شام، چار محافظین تمہارا کھانا لے کر آئے۔ وہ بے حد محتاط تھے۔ دو ڈیوڑھی میں رُک گئے، ایک نے اندرونی دروازہ کھولا، اور دوسرے نے کھانے کی ٹرے ہاتھ میں لیے دہلیز پار کی اور پھر فوراً ہی ٹرے اُس کے ہاتھ سے گر کر فرش پر جا پڑی، خداوند، خداوند یسوع، یہ کیا، یہ کیا ہوا، سیل بالکل خالی تھا! اور چارپائی پر ایک رقعہ پڑا تھا! ''میرے پیارے زاکاراکس (Zakarakis) سلام محبت قبول ہو، میں بہت جلد، شرط کے مطابق تم سے کرنل کی وردی وصول کرنے آؤں گا۔ اگر تمہاری ملاقات تھیوفلیواکوس (Theophiloiannakos) اور ہیززکس (Hazizkis) سے ہو تو انہیں میری طرف سے پیغام دے دینا کہ میں اُن کا نجس خون پیشاب کے راستے نکلواؤں گا، اگر تمہیں جنرل آئیونیڈیز (Ioannidis) ملے تو اُسے میری طرف سے درخواست کرنا کہ اَب وہ تمہیں پنشن پر بھیج دے۔ فقط تمہارا شیدائی، آلیکاس۔

☆☆☆

غزلیات

ارشدؔ ملتانی

اک حسیں گیت ہے پھواروں کا
زندگی رقص ہے ستاروں کا

شامِ مے خانہ ہو کہ صبحِ چمن
آدمی حُسن ہے نظاروں کا

موجِ طوفاں کے رقص پیہم ہیں
دھیان کس کو رہے کناروں کا

چاندنی کا طلسم ٹوٹ چُکا
کھل گیا ہے بھرم ستاروں کا

اس قدر خامشی و تنہائی
دل دھڑکتا ہے چاند تاروں کا

شعلۂ گل کی آنچ سے ارشدؔ
دل نہ جائے پگھل بہاروں کا

ارشدؔ ملتانی

تختۂ دار تک نہیں پہنچا
عشق معیار تک نہیں پہنچا

عزم و اصرار تو زیادہ ہے
جہد و پیکار تک نہیں پہنچا

غیر ممکن نہیں جواب اس کا
خط ابھی یار تک نہیں پہنچا

کچھ نہ کچھ راہ پر تو آیا ہے
قول اقرار تک نہیں پہنچا

کچھ تامّل ضرور ہے اس کو
صاف انکار تک نہیں پہنچا

میرا دیوان چوم لیتا ہے
میرے اشعار تک نہیں پہنچا

یوں تو جذبہ جوان ہے ارشدؔ
خون کی دھار تک نہیں پہنچا

☆☆☆

ارشدؔ ملتانی

خامشی محشر افکار کا سایہ تو نہیں
وقت کی چُپ کسی پیکار کا سایہ تو نہیں

وہی رعنائی کا عالم ہے وہی جلوے ہیں
موسمِ گل ترے رُخسار کا سایہ تو نہیں

لذت درد بھی ہے روح کی تسکین کے ساتھ
دامن گل پہ کسی خار کا سایہ تو نہیں

بیٹھ جائیں گے جہاں چاہیں گے دیوانے ترے
دشتِ غم ہے تری دیوار کا سایہ تو نہیں

کس تلوّن سے اداؤں سے اُڑا جاتا ہے
وقت پر تیزیِ رفتار کا سایہ تو نہیں

حُسن کے جلوے بہ ہر رنگ ہیں محتاجِ نظر
تری ہستی مرے معیار کا سایہ تو نہیں

سوچ لے عرضِ تمنا سے یہ پہلے ارشدؔ
نطق میں تلخیٔ گفتار کا سایہ تو نہیں

☆☆☆

ارشدؔ ملتانی

قلم یا ہاتھ میں تلوار رکھنا
بہ ہر صورت کوئی معیار رکھنا

بڑی ویرانیاں ہیں زندگی میں
طبیعت کو گل و گلزار رکھنا

بہت مسحور کر لیتی ہیں دل کو
تمناؤں سے آنکھیں چار رکھنا

چلے ہو گر کسی کی جستجو میں
خبر اپنی بھی میرے یار رکھنا

نہ جانے کیوں خدا کو بھا گیا ہے
مجھے بے بس ، اُسے مختار رکھنا

ضروری ہے رفاقت ساحلوں کی
سمندر سے بھی لیکن پیار رکھنا

بہت نازک زمانہ ہے یہ ارشدؔ
سنبھل کر سر پہ اب دستار رکھنا

ارشدؔ ملتانی

وقت کی طغیانیوں میں گم ہوئے
ہم انوکھے پانیوں میں گم ہوئے

رات کی ظلمت میں جو بھٹکے نہ تھے
صبح کی تابانیوں میں گم ہوئے

کتنے جذبے آنسوؤں میں بہہ گئے
کتنے شعلے پانیوں میں گم ہوئے

جاگتی ، جیتی شبیہیں مٹ گئیں
آئینے حیرانیوں میں گم ہوئے

فکر و فن کے کتنے زندہ معجزے
شعبدہ سامانیوں میں گم ہوئے

جن کے دم سے تھیں جواں مہنگائیاں
وقت کی ارزانیوں میں گم ہوئے

آبرو جام و سبو کی لٹ گئی
میکدے ویرانیوں میں گم ہوئے

کس قدر مضبوط ساحل تھے مگر
کتنے گہرے پانیوں میں گم ہوئے

منزلوں کی مشکلوں سے جو بچے
راہ کی آسانیوں میں گم ہوئے

ارشدؔ ملتانی

ہر گھڑی احتساب کا فرمان
زندگی ہے کہ حشر کا میدان

ہر نفس میں ہے اک نیا طوفان
زندگی کے مزاج کو پہچان

شور محشر کا انتظار نہ کر
دل کی آواز کو غنیمت جان

ہم نے پایا ہے دوستی کا راز
ہم چھڑکتے ہیں دشمنوں پر جان

کون سمجھا ہے کون سمجھے گا
مختصہ ہے یہ زیست کی چوگان

ہر قدم پر نصرتوں کی نوید
ہر قدم پر شکست کا امکان

یوں گزاری ہے زندگی ہم نے
جیسے صحرا میں کوئی نخلستان

دل کے تاروں کو چھیڑ آہستہ
ٹوٹ جائے نہ زندگی کی تان

تری عظمت پہ ہے نثار ارشدؔ
اے مری زندگی مرے ملتان

☆☆☆

ارشؔد ملتانی

دشت ہمارے خار ہمارے
کتنے ہیں غم خوار ہمارے

ٹوٹ گرے ہیں عین بھنور میں
ہاتھوں سے پتوار ہمارے

گھر کی ویرانی کا ماتم
بارونق بازار ہمارے

ایک نئی آہٹ کے تانگی
بند در و دیوار ہمارے

ساتھ کہاں تک دے سکتے ہیں
فرسودہ معیار ہمارے

بنیادوں کی بات نہ چھیڑو
اونچے ہیں مینار ہمارے

پتھر لوگوں کی نگری میں
کیا کرتے اشعار ہمارے

رنج و الم ہیں سنگی ساتھی
درد بنے دلدار ہمارے

بے رنگی نے رنگ جمایا
اجڑے نقش و نگار ہمارے

مبہم مبہم سی تاویلیں
بے مقصد اشعار ہمارے

خوشبوئیں دم ساز ہیں ارشؔد
باغ بغوچے یار ہمارے

ارشؔد ملتانی

کچھ بڑھ گیا ہے ذوقِ خریدار بھی بہت
کچھ کھل گئے ہیں شہر میں بازار بھی بہت

سب ہم کنار جلوۂ صبح طرب نہیں
ہیں شب کی تیرگی میں گرفتار بھی بہت

اب گیسوؤں کی چھاؤں کی حسرت نہیں رہی
ہے بیٹھنے کو سایۂ دیوار بھی بہت

کچھ رہ رووں کی سست روی کا بھی ہے قصور
کچھ مرحلے ہیں زیست کے دشوار بھی بہت

پیدا صنم کدوں کے ثناخواں ہوئے تو کیا
دیں بیچنے کو پھرتے ہیں دیں دار بھی بہت

ارشؔد رفاقتِ غمِ دوراں بھی خوب ہے
پر لطف دے رہا ہے غم یار بھی بہت

نجم الاصغر شاہیا

اس سے پہلے کہ یہ صدمہ مجھے پتھر کر دے
اے مری زُود حِسی آنکھ مری تر کر دے

زندگی لائی ہے اب ایک نیا منصوبہ
خود کشی کا ہے ارادہ تو موخر کر دے

شب کی دیوار سے ٹکرایا تو ہے اِک جگنو
سعیِ پیہم سے وہ ممکن ہے کوئی دَر کر دے

مردِ آہن ہوں کہیں زنگ نہ لگ جائے مجھے
رنگ اِن سُرخ لبوں سے مرا پیکر کر دے

سینچ مت آنسوؤں سے باغ تمناؤں کے
کہ نہ یہ سیم کا پانی انہیں بنجر کر دے

جھرّیاں رُخ پہ ضعیفی کا نشاں ہیں اصغؔر
ان لکیروں کو تُو بگڑے ہوئے تیور کر دے

☆☆☆

نجم الاصغر شاہیا

چاک والا جو بنائے وہی مٹّی بن جائے
کوئی کُوزہ کوئی خُم کوئی صُراحی بن جائے

دل میں یاد اُس کی ہر اک رُت میں رہے نغمہ سنج
کبھی کوئل، کبھی بلبل، کبھی قمری بن جائے

پُشت پر اُس کی ہیں چُنری کے مُنقّش آنچل
تیز جھونکا کوئی آئے تو وہ تتلی بن جائے

کوئی غم دل میں ہو آباد کہیں سے آ کر
پہلے اِک گھر بنے، کچھ روز میں بستی بن جائے

کیا خبر سحر ہے زنجیر خمِ زُلف میں کیا
کہ اُسے پہنے بغیر آدمی قیدی بن جائے

اصغؔر اظہار کے سو رستے ہیں کوئی شاعر
کوئی نقّاش کوئی شخص مغنّی بن جائے

قاضی حبیب الرحمٰن

یہ جو ہر سمت ایک سا ہے کوئی
آئنہ ، پیشِ آئینہ ہے کوئی

کیا تماشا ہے میری آنکھوں سے
اپنا بہروپ دیکھتا ہے کوئی

سو رہے ہیں تمام اہلِ نظر
نیند کے گھر میں رت جگا ہے کوئی

جانے اس اک نگاہ میں کیا تھا
جب سے عالم ہی دوسرا ہے کوئی

گونج اُٹھتا ہے اور سناٹا
ایسے لہجے میں بولتا ہے کوئی

جھلملاتا ہے دل میں ایک خیال
بارے روشن کہیں دیا ہے کوئی

اک زمانے سے سن رہے ہیں یہی
اک زمانے سے آ رہا ہے کوئی

صبح تعبیر جانے کیا دکھلائے
رات کے دل میں خواب سا ہے کوئی

اک کرن مسکرا کے کہتی ہے
گھپ اندھیروں میں راستہ ہے کوئی

ایک چھینٹا ادھر بھی ابرِ نشاط
ایک مدت سے جل رہا ہے کوئی

ہائے ، مجبوریاں محبت کی
مدعا کوئی اور دعا ہے کوئی

دل کو ہے آرزوئے امر محال
سر کو سودائے ماورا ہے کوئی

پوچھتے کیا ہو فاصلہ جاں تک
بس یہی ایک تیر کا ہے کوئی

دل کے حالِ قرار پر مت جا
یہ بھی وحشت کا سلسلہ ہے کوئی

اب تو برسوں ، خبر نہیں ملتی
منقطع ایسا رابطہ ہے کوئی

یوں ہوئی مسخ صورتِ احوال
نہیں کھلتا ، یہ میں ہوں یا ہے کوئی

پھول، کانٹوں میں تل رہے ہیں حبیبؔ
طُرفہ اس باغ کی ہوا ہے کوئی

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

دُور تک کوئی وہم ہے نہ یقیں
رات بھر دل میں وہ ہوائیں چلیں

اُڑتے پھرتے تھے سب زمان و مکاں
نقطۂ رقص میں تھا کوئی حسیں

ماورائے شعورِ انسانی
جانے کیا کیا حقیقتیں چھلکیں

ہائے ! وہ لہریں جو سرِ دریا
ایک بار اُبھریں پھر نہیں اُبھریں

کیا مناظر تھے ! اب یہ سوچتا ہوں
میری آنکھیں بھی میری آنکھیں نہ تھیں

پھُوٹی پڑتی ہیں ذرّے ذرّے سے
مر گئے پر بھی خواہشیں نہ دبیں

ایک چہرہ کہ حاصلِ جاں تھا
اب بھی رہتا ہے دل کے پاس کہیں

بکھرا جاتا ہے کوئی اندر سے
لاکھ رکھیں سنبھال اپنے تئیں

ایک صورت سنوارنے کے لیے
ایک سو چودہ سورتیں اُتریں

پردہ ، وہ ہے کہ کچھ نہیں کھُلتا
صورتِ کفر ہے کہ حالتِ دیں

مگر اَب اِس کو کون سمجھے گا؟
دل پہ جو جو قیامتیں گزریں

کچھ شکستہ مکان باقی ہیں
خیر سے لد گئے وہ سارے مکیں

آنکھ سے دل تک ایک عالم ہے
آنکھ نم ناک ہے ، نہ دل خونیں

ایسا اندھیر ، کس نے دیکھا تھا؟
اب کے سورج سے ظلمتیں پھوٹیں

ہو گئی بانجھ کوکھ دھرتی کی
ایسی آکاش سے رُتیں برسیں

پڑ گئے ماند کھیت سرسوں کے
آنگنوں میں وہ زردیاں پھولیں

اب کے آیا ہے خانۂ دل میں
ایسا سیلاب حسرتیں بھی گئیں

دید تھا جو شنید بھی نہ رہا
کب سُنی تھیں؟ جو صورتیں دیکھیں

کیسے کیسے تھے شہر یار ! یہاں
کیسی کیسی تھیں دولتیں! نہ رہیں

شُہدے بیٹھے ہیں بن کے وارثِ تخت
مارے پھرتے ہیں، دولتوں کے امیں

یوں ہوئی منقلب ، بساطِ حیات
مٹ گیا فرقِ آسمان و زمیں

جیسے یہ سارا عالمِ امکاں
ایک چکر ہے اور کچھ بھی نہیں

روزِ روشن کی آرزو میں حبیبؔ
زندگی کٹ گئی ، شبیں نہ کٹیں

☆☆☆

احمد صغیر صدیقی

یوں ہی کب آئنہ وہ آئنہ گر کھولتا ہے
قید کرنے کے لیے راہِ مفر کھولتا ہے

چشمِ حیرت بنے رہتے ہیں مرے شام و سحر
وہ کہ ہر روز کوئی رازِ دگر کھولتا ہے

کب سے بیٹھا ہوں اِدھر نیند بھرے، آنکھوں میں
دیکھئے خواب میں وہ کون سا دَر کھولتا ہے

منزلیں میرے تلوّن سے پریشاں ہیں بہت
بند کرتا ہے کبھی باب سفر کھولتا ہے

دیکھئے ملتا ہے کب حرف تمنّا کو بدن
دیکھئے کب وہ ان ہاتھوں پہ ہنر کھولتا ہے

☆☆☆

احمد صغیر صدیقی

آتی ہے کہاں شمع کو پروانہ نگاری
یہ عشق ہے ، کرتا ہے جو دیوانہ نگاری

اس گھر سے نکلنا ہے بہر طور ہمی کو
اوروں سے تو ممکن نہیں ویرانہ نگاری

ہر نیند کی قسمت میں کہاں نشّہ گہہِ خواب
ہر رند کے بس کی نہیں پیمانہ نگاری

کُھلتا ہی نہیں کچھ ، یہ حقائق ہیں کہ قصّے
ہے اور طرح کی مری افسانہ نگاری

اک نام چھپانا تھا سو کرتے رہے تا عمر
سلمانہ نگاری کبھی ریحانہ نگاری

ڈاکٹر خیال امروہوی

ابلیس کی شہ پر نہ کسی شر سے لگی ہے
جو آگ لگی ہے وہ مرے گھر سے لگی ہے

کیوں سر سے متانت کا لہو پھوٹ رہا ہے
کیا چوٹ کسی طفل کے پتھر سے لگی ہے

کافی نہیں اندر سے کواڑوں کو تھپکنا
کنڈی درِ تہذیب پہ باہر سے لگی ہے

ٹھوکر تو سراسیمہ نگاہی سے لگی تھی
اوہام کا دعویٰ کہ مقدر سے لگی ہے

ممکن ہے کہ برسوں نہ فراموش ہو دل سے
وہ ضرب جو احباب کے کنکر سے لگی ہے

☆☆☆

ڈاکٹر خیال امروہوی

نظامِ جبر کے انداز لاجواب ملے
کہ بحرِ نوش کو چُلّو سے کم شراب ملے

یہ عدل کس کی عدالت کا شاخسانہ ہے
ثواب پیر بٹورے ہمیں عذاب ملے

سُنا تھا چشمِ عُقابی غیور ہوتی ہے
یہاں تو زاغ سے بھی کم نظر عقاب ملے

درندہ نسل پہ کیوں صاعقہ نہیں گرتی
ہوا کو پوچھنا ہوگا ، اگر سحاب ملے

جو خود کو آہنی اندام کہتے پھرتے تھے
وہ گرد راہ بنے صورتِ حباب ملے

تمہیں خلا میں پہنچ کر بھی تابشیں نہ ملیں
ہمیں زمیں کی تہوں میں بھی آفتاب ملے

کسی نے علم کی خاطر مذاکرہ نہ کیا
دیارِ جہل میں سب صاحب کتاب ملے

ڈاکٹر خیال امروہوی

میں کس نظام میں ہوں میرے آس پاس ہے کیا
میں کچھ نہیں تو یہ افکار کا ہراس ہے کیا

شعورِ محض کا گاہک کبھی نہ آئے گا
اس ایک شے کے سوا اور میرے پاس ہے کیا

ضرورتوں نے سکھایا ہے سنکھیا پھانکوں
وگرنہ آدمی کیا ہے اور التماس ہے کیا

کہیں خلوص کے چھینٹے کہیں ہے خوں پاشی
یہ میرے عہد گزشتہ کا اقتباس ہے کیا

تجلیوں میں حرارت نہ تابشوں میں جمال
مری طرح سے خدا بھی مرا اداس ہے کیا

کسی بھی عہد میں کیا میں نہ یاد آؤں گا
وہ میرا ''زیرِ کرم'' ، ایسا ناسپاس ہے کیا

ڈاکٹر خیال امروہوی

تابشِ مہر اناالحق ہے جہاں تک دیکھوں
میں تو محدود ہوں ''بے حد'' کو کہاں تک دیکھوں

تو مری رامشِ خلقت سے بھی واقف نہ ہوا
میں تو ہر آن ترا سرِّ نہاں تک دیکھوں

دل وہ آئینہ تمثال ہے جس میں اکثر
عکسِ ارژنگیٔ ''مانی نفساں'' تک دیکھوں

مجھ کو وہ قوتِ ابصار عطا کر جس سے
تو جہاں تک نظر آئے میں وہاں تک دیکھوں

تجھ سے ایمان کا معیار بھی پرکھا نہ گیا
میں تو زندیقیٔ ایماں نشاں تک دیکھوں

کتنی جلاد ہے طبقات کی پرکیف حشیش
جس کا منحوس اثر خورد کلاں تک دیکھوں

☆☆☆

خاور اعجاز

آخری منزل ہے اور رستہ بدلنا ہے مجھے
اپنے پاؤں پر یہاں سے آگے چلنا ہے مجھے

ٹانکنے ہیں رُوح میں اُس آسماں کے مہر و ماہ
اور بدن پر اِس زمیں کی خاک ملنا ہے مجھے

جسم کا تیرہ مکاں گرنے سے پہلے ایک دن
تیرے رُخ کی چاندنی اوڑھے نکلنا ہے مجھے

ذات کے اِس شور میں تُو ہی مجھے سمجھائے گا
کون سی آواز کے ہمراہ چلنا ہے مجھے

اور کتنے خواب پیکر راستے میں آئیں گے
کون سے آہنگ میں آخر کو ڈھلنا ہے مجھے

پھول میرے تھے مگر دامن میں اُس نے چُن لیے
آگ اُس کی تھی مگر اب اس میں جلنا ہے مجھے

خاور اعجاز

جہانِ حیرت میں ایک دن ہم بھی کھو گئے تھے
پھر ایک دیوار سے لگے اور سو گئے تھے

کسی خلا نے پھر اپنے اندر سمو لیا تھا
چراغ اپنی ہوا میں دو گام تو گئے تھے

اُنہوں نے بھی اُس طرف کی کوئی خبر نہیں دی
وہ ہم سے پہلے ندی کے اُس پار جو گئے تھے

ہمیں نہیں چاہیے تھا کچھ بھی درِ شہاں سے
فقیر تھے ہم ، ہمارے سب کام ہو گئے تھے

ہوا تھا شہرِ جمال میں اتّفاق ایسا
وہ جس دن آیا تھا ہم اُسی شام کو گئے تھے

سُنا ہے پتّھر میں بھی نمی سی تو آ گئی تھی
ہمارے اشعار اُس کی پلکیں بھگو گئے تھے

ہجومِ عشاق اب بھی واں منتظر کھڑا ہے
جہاں ہم اک روز اپنی کشتی ڈبو گئے تھے

وہی کہانی کے موڑ پر آ ملا ہے پھر سے
وہ جس کو ہم ابتدائے فرقت میں رو گئے تھے

تو کِس نے تھاما تھا آخری معرکے میں ہم کو
ہمیں تو نیند آ رہی تھی تب ہم تو سو گئے تھے

☆☆☆

قیوم طاہر

ڈوبتے جسم کو ، کیا ہاتھ ہلانے سے ملا
کون ویران کنارے پہ بُلانے سے ملا

اپنی آنکھیں بھی جلا بیٹھا ہوں ہاتھوں کی طرح
اور کیا مجھ کو چراغوں کو بچانے سے ملا

کھول لیں آپ ہی سب عشق نے گرہیں ساری
دل ، کہ اس بار کسی بھی نہ سیانے سے ملا

ایک بادل کی طرح سائے میں اُس کو رکھا
اُس بدن سے، تو میں بارش کے بہانے سے ملا

سلوٹیں اُگنے لگیں پھیلے ہوئے ہاتھوں پر
کوئی سکّہ ، نہ دلاسہ بھی خزانے سے ملا

کتنے ٹکڑوں میں کسی مان کی صورت ٹوٹا
کیا بگولے پہ تجھے تیر چلانے سے ملا

اب وہ قیوم دھمالوں میں کہاں کا نشہ
جو محبت میں ، کبھی خود کو نچانے سے ملا

☆☆☆

قیوم طاہر

اس طرح بچھڑ کے کیا واقعی گزرتی ہے
دیکھتے ہیں ، کیسے اب زندگی گزرتی ہے

اپنے اپنے حصے کی آگ لے کے بیٹھے ہیں
وہ ملے تو پوچھوں میں، یوں بھی گزرتی ہے

رابطے نہ ہوں پھر بھی ، ایک ربط رہتا ہے
کھڑکیوں کی درزوں سے، روشنی گزرتی ہے

بے سبب سہی تو کیا ، اس طرف کو آ نکلو
جگمگاتے رستوں سے اک گلی گزرتی ہے

فیصلے بدلنے سے ، کیا لکیر بدلے گی
اب بُری گزرتی ہے یا بھلی گزرتی ہے

اُس کے نام کا کاغذ ، جالیوں پہ رکھتا ہوں
شکل اک سجا کر پھر چاندنی گزرتی ہے

قیوم طاہر

تیری خاطر تو ہمی نے رکھا
آگ پر ہاتھ کسی نے رکھا؟

کیا دکھاتے تجھے دل کے موسم
کچھ بھرم دل کی کلی نے رکھا

سیدھے رستے سے بھی رشتہ اپنا
اک تعلق بھی کجی نے رکھا

بجھ گئی رونقِ بازار ، تو پھر
راستہ اندھی گلی نے رکھا

اپنے سینے پہ سہارا اُس کو
بوجھ جو آدھی صدی نے رکھا

تپ گئیں برف زمینیں ساری
پاؤں ، کسی پاؤں جلی نے رکھا

تجھ کو جانا بھی کسی نے قیوم
تجھ سے رشتہ تو سبھی نے رکھا

☆☆☆

قیوم طاہر

یہ اپنی جگ ہنسائی کب تلک ہے
مگر تیری خدائی کب تلک ہے؟

ستارے چال اپنی چل چکے ہیں
تری فرماں روائی کب تلک ہے

سحر سے پہلے پہلے خرچ ہوگی
اندھیروں کی کمائی کب تلک ہے

بس اک آواز کی دُوری پہ سارے
یہ پتھر اور رائی کب تلک ہے

کوئی ہموار رستہ بھی تو آئے
چڑھائی ہی چڑھائی کب تلک ہے

مرا سورج بھی مجھ سے پوچھتا ہے
یہ دکھ کی رات ، بھائی کب تلک ہے

پرندہ چوگ لینے کو نہ جائے
یہ صورت انتہائی کب تلک ہے

میں اپنے ابر سے قیوم پوچھوں
مرے دریا پہ کائی کب تلک ہے

قیوم طاہر

اب تُو بلائے تیرگی ، چاہے کہیں بھی وار کر
کب کے دیئے بجھا دیئے ، تیز ہوا سے ہار کر

کس سے کہیں کہ کیا ہوا، سود و زیاں کے کھیل میں
کھول نہ بھید کی گرہ ، خود کو نہ شرمسار کر

اب کے نہ جانے گیان کا، کون سا راستہ ملے
برف سے کی ہے دوستی، آگ سے میں نے ہار کر

عالمِ بے یقین میں ، جھوٹی سچی کہانیاں
سُن تو لے اُس کی داستان اس کا نہ اعتبار کر

ایسا نہ ہو کہ سب مکیں ، دُور کہیں پہ جا بسیں
اب کے اے موجِ آب تُو ، کھیت بھی واگزار کر

ہم بھی عجیب لوگ ہیں ، اتنی عجیب خواہشیں
ڈھونڈ رہے ہیں ذائقے ، کچے ثمر اتار کر

☆☆☆

قیوم طاہر

راکھ ہوتی ساعتوں کا تُو امیں ، شاید نہیں
تجھ پہ بھی قیوم طاہر اب یقیں ، شاید نہیں

ایسا لگتا ہے ، گریزاں اپنی مٹی سے سبھی
ایسا لگتا ہے کہ یہ اپنی زمیں ، شاید نہیں

سب کے ماتھے پر اندھیرے کی کہانی درج ہے
کوئی بھی اُجلے مکانوں کا مکیں ، شاید نہیں

ہم نے کتنے خواب لکھے ہیں فصیلِ شہر پر
ایک بھی تعبیر گلیوں میں کہیں ، شاید نہیں

اب تو دشتِ ذات میں ، کوئی جرس بجتی نہیں
اب دعا کا لفظ ہونٹوں کے قریں ، شاید نہیں

کون سی جانب وہ بہتے رنگ کے بجرے گئے
اپنے ساحل پر تو عکسِ نیلمیں ، شاید نہیں

اب ہوائیں ، موسموں کے زاویے بھی دیکھ لیں
شہرِ گل ہے اور موجِ یاسمیں ، شاید نہیں

پرویز ساحر

بادِ تازہ کی طرح آیئے گا
روز کہتے ہیں کہ آپ آئیں گے
آپ کو اپنی جوانی کی قسم
دل اگر زور کرے ملنے کو
ایک مدت سے نہیں پی میں نے
پہلے فریاد تو سُن لیں میری
میرے آگے تو نہ شرمائے آپ
کیا کہا آپ نے ؟ میں سمجھا نہیں
میرے کہنے میں نہیں آتا یہ دل
ہم نہ ہوں گے تو اِسی بزم میں آپ
چاہے کتنی سی بھی کوشش کرلیں
جیتے جی تو مری کچھ قدر نہ کی
شوق سے قتل کریں مجھ کو مگر
چاہے جس درجہ بھی مجبور ہوں آپ
یہ دُعا ہے کہ پسِ مُردن بھی
میں پیمبر نہیں ، اک شاعر ہوں

میرا آنگن کبھی مہکایئے گا
کبھی سچ مچ کے بھی آجایئے گا
میری خاطر ذرا انگڑایئے گا
اسے زنجیر سے بہلایئے گا
آج شب آنکھوں سے پلوایئے گا
پھر بصد شوق ستم ڈھایئے گا
آئنہ دیکھ کے شرمایئے گا
اک ذرا بات کو دہرایئے گا
آپ ہی کچھ اِسے سمجھایئے گا
اپنے سائے سے بھی گھبرایئے گا
آپ مجھ کو نہ بھُلا پایئے گا
بعدِ مُردن مرے گُن گایئے گا
اپنے کُوچے ہی میں دفنایئے گا
پر کبھی ہاتھ نہ پھیلایئے گا
آپ جنت کی ہوا کھایئے گا
مجھ پہ ایمان نہ لے آیئے گا

جب بھی خوشبو کی طلب ہو ساحر
مثلِ صندل مجھے سُلگایئے گا

☆☆☆

دل نواز دلؔ

میری نظروں سے جہاں دیکھے تجھے
دل نہاں ہو کر عیاں دیکھے تجھے

کس جگہ ڈھونڈے تجھے کوئی بتا
اے خدا کوئی کہاں دیکھے تجھے

اے نگاہِ ناز تیرِ نیم کش
کھینچ کے ابرو کماں دیکھے تجھے

تیری باتوں میں روانی ہے عجب
ٹھہر کے ہر اک زباں دیکھے تجھے

نرگسِ بیمار ، اے جانِ شفا
شیشۂ آبِ رواں دیکھے تجھے

آئنہ فریاد سے بے آب ہے
آہ بھر بھر کے فغاں دیکھے تجھے

جا رہا ہے تُو دیارِ غیر کو
کس نظر سے تیری ماں دیکھے تجھے

اے مرے دل اے مری جانِ ہدف
شوق سے ہر دید باں دیکھے تجھے

اے دلِ کون و مکاں ، جان آفریں
اک جہاں ، ہر ایک جاں دیکھے تجھے

کس یقیں سے دیکھتا ہے دلؔ کو تُو
اور کن آنکھوں سے گماں دیکھے تھے

پرویز ساحرؔ

گھر سے آتے ہوئے اِک دُعا لایا تھا
میں کہ رختِ سفر میں دِیا لایا تھا

کیوں نہ مجھ پر برستے یہ پتھر کہ میں
شہرِ کم ظرف میں آئنہ لایا تھا

میں وہ عاشق کہ جو کوچۂ یار سے
نقشِ خاکِ کفِ پا اُٹھا لایا تھا

کیوں نہ ہوتی بھلا رَد مری شاعری
میں کہ لہجہ ہی اپنا نیا لایا تھا

میں جب آیا تھا پہلے پہل گاؤں سے
اپنے ہمراہ تازہ ہوا لایا تھا

کیوں غلط فہمیاں ، آگئیں درمیاں
کیوں ترے شیشۂ دل میں بال آیا تھا

اُس نے بس ایک تحفے کا مجھ سے کہا
اور میں بازار گھر میں اُٹھا لایا تھا

میں کبھی اِس طرف کو نہ آتا مگر
ایک سیلاب مجھ کو بہا لایا تھا

ایک لمحے کو ہر شے چمک سی اُٹھی
ایک لمحے کو اُس کا خیال آیا تھا

کیوں نہ ہو سب زمانہ مرا معترف
میں کہ ساحرؔ عدو کو منا لایا تھا

محمد فیروز شاہ

لٹ کر بھی کھڑا تو ہے بے برگ شجر تنہا
آندھی سے لڑا تو ہے بے برگ شجر تنہا

پتوں نے ہواؤں کے آگے تھی سپر ڈالی
اپنی پہ اُڑا تو ہے بے برگ شجر تنہا

کچھ لوگ جڑوں سے بھی کٹ کر ہیں جیا کرتے
دھرتی میں گڑا تو ہے بے برگ شجر تنہا

چھاؤں نہ سہی پھر بھی ڈھارس ہے مسافر کی
رستے میں کھڑا تو ہے بے برگ شجر تنہا

توقیر ثمر سے ہے ، فیروزؔ ، یہاں ، ورنہ
قامت میں بڑا تو ہے بے برگ شجر تنہا

محمد فیروز شاہ

خوشبوؤں کا سلام رستے میں
لے کے آتی ہے شام رستے میں

اپنے اپنے لہو سے لکھ جاؤ
کون کون آیا کام رستے میں

کیا خبر طائرِ مسافر کو
کیسے کیسے ہیں دام رستے میں

کرچیاں منزلوں تک آ پہنچیں
کس کا ٹوٹا ہے جام رستے میں

آس دم توڑنے لگی جب بھی
لکھ دیا تیرا نام رستے میں

ساتھ کیا زادِ راہ لے جائیں
رہزنی جب ہے عام رستے میں

☆☆☆

محمد فیروز شاہ

گرچہ اس سے آگ نہیں بجھ پائی تھی
چڑیا چونچ میں بھر کر پانی لائی تھی

حسن بہت انمول تھا ، گاہک با ثروت
سوت کی اٹی لے کر وہ بھی آئی تھی

کرنوں سے یاری کا ذوق بجا ، لیکن
شام نگر کی اپنی اک رعنائی تھی

عشق خمیر میں اور ضمیر انا والا
رب نے عمر بجھارت یوں بجھوائی تھی

میرے اشک تو ناکامی کے پرچم تھے
اس پر کیوں ایسی کیفیت چھائی تھی

اب جو بانٹتی پھرتی ہے سب زرد کفن
یہی ہوا کل تک گل کی شیدائی تھی

جب پنچھی ، فیروؔز ، پیاسے لوٹ گئے
ایک ندامت لہروں میں لہرائی تھی

☆☆☆

محمد فیروز شاہ

اندھیروں کے حوالے ہو رہی ہے
زمیں اپنے اُجالے کھو رہی ہے

ضرورت خون کی تھی ، پَر یہ بستی
ندامت آنسوؤں سے دھو رہی ہے

بہا ہے پھر لہو صدق و یقیں کا
زمینِ کربلا پھر رو رہی ہے

اسے تو زعم تھا قوت کا بے حد
تو پھر یہ کس کے لاشے ڈھو رہی ہے

تناور پیڑ ہوں گے کل مقابل
ہوا جو بیج اب کے بو رہی ہے

اگرچہ دوریاں مجبوریاں تھیں
گلوں کی فکر بلبل کو رہی ہے

نگاہِ بد نگاہاں جاگتی ہے
مگر فیروؔز نگری سو رہی ہے

نوازش علی ندیم

مرے لہو میں کڑے رتجگے اُتارتا ہے
یہ کون ہے جو میری زندگی گزارتا ہے

لپٹتا جاتا ہے زنجیر بن کے قدموں سے
کوئی تو ہے جو مجھے بے صدا پکارتا ہے

غبارِ وقت سے میلا کبھی نہیں ہوتا
غموں کی آنچ سے جو خال و خد نکھارتا ہے

میں اُس کے واسطے مسجود لفظ ڈھونڈتا ہوں
سکوتِ شب میں جو مجھ پر غزل اُتارتا ہے

کہیں خوشی سے نوازشؔ کہیں پہ مجبوراً
ہر ایک شخص یہاں کوئی روپ دھارتا ہے

☆☆☆

نوازش علی ندیم

کارِ دشوار ہونا چاہتا ہوں
تیرا معیار ہونا چاہتا ہوں

خواب نازل ہوا تو میں نے کہا
اب میں بیدار ہونا چاہتا ہوں

یا تری ڈھال بننا چاہتا ہوں
یا ترا وار ہونا چاہتا ہوں

میں نہ ہونے کی قید سے چھُٹ کر
صرف اک بار ''ہونا'' چاہتا ہوں

جس نے شاعر بنا دیا مجھ کو
اس کا اظہار ہونا چاہتا ہوں

میں کہ انکار کر چکا ہوں ندیؔم
اب میں اقرار ہونا چاہتا ہوں

منور عزیز

کمال کا کوئی استعارہ کسے ملے گا
جہت نما خوش خبر ستارہ کسے ملے گا

ابھی سبھی ڈوبتے اُبھرتے ہیں مرحلوں میں
سراب کا آخری کنارہ کسے ملے گا

گمان کی اُنگلیوں سے پیکر تراشنا ہے
وہ انتہائے نظر ہے سارا کسے ملے گا

کہاں کہاں خواہشوں کے سائے بھٹک رہے ہیں
جو نقش میں نے نہیں اُتارا کسے ملے گا

سُخن سُخن کس کی سچ صداؤں کے عہد نامے
مری طرح سود میں خسارہ کیسے ملے گا

سب اپنی اپنی تلاش میں کھو گئے منوّر
اگر ملا ، غیب سے اشارہ کسے ملے گا

☆☆☆

عطاالرحمٰن قاضی

دل پریشاں بجھا بجھا منظر
مجھ کو لگتا ہے آشنا منظر

کون سمجھے مرے وجود کا کرب
کون دیکھے بجھا ہوا منظر

اک طرف چاند، اک طرف مرا دل
آؤ دیکھو تو رات کا منظر

میرے دل میں سمٹ گیا یکسر
کتنے قرنوں پہ پھیلتا منظر

دے رہا ہے سراغ صبحِ مراد
شب کی چلمن سے جھانکتا منظر

سنگ دل! ہاں ذرا، سنبھل کے ذرا
ٹوٹ جائے نہ آئنہ منظر

کس نے دیکھا ہے آنکھ بھر کے عطاؔ
ایک منظر میں دوسرا منظر

عطاالرحمٰن تمثیل

منے تیز ہوا کے یہ دیا کچھ بھی نہیں
بجھ گیا یہ تو میرے پاس بچا کچھ بھی نہیں

اک محبت تھی زمانے پہ لٹا دی وہ بھی
اس کے بدلے میں زمانے سے لیا کچھ بھی نہیں

تجھ سے کہتے تھے بچھڑ کر نہ جیا جائے گا
ہو گیا تو بھی جدا اور ہوا کچھ بھی نہیں

اس محبت کے علاوہ ہمیں کیا آتا ہے
اس محبت کے علاوہ تو کیا کچھ بھی نہیں

تجھے رسوائی کا ڈر تھا مجھے تنہائی کا
دنیا والوں نے ترے بارے کہا کچھ بھی نہیں

☆☆☆

عطاالرحمٰن تمثیل

سوچ میں کیسے در آئی ہے روانی آج کل
پڑھ رہا ہوں اس کے چہرے کو زبانی آج کل

بے نشاں ہونے میں جانے کون سا ہے فائدہ
بھول جاتا ہوں میں اپنی ہی کہانی آج کل

ایک الجھن میں گزرتے ہیں مرے شام و سحر
خواہشوں میں بٹ گئی ہے زندگانی آج کل

دشت میں پھیلے ہوئے ہیں قافلے ہی قافلے
کر رہے ہیں سب مکیں نقلِ مکانی آج کل

کس کے ہاتھوں میں ہیں اب سارے جہاں کی مشعلیں
کون کرتا ہے غموں کی ترجمانی آج کل

نظمیں

نجم الاصغر شاہیا

قبرستان میں اُگنے والی نرگس بولی

کئی دن دفن میں زیرِ زمیں خود، رہ کے آئی ہوں
گواہِ معتبر ہوں میں
لحد میں جنت و دوزخ کا کوئی در نہیں کھلتا
کسی مُردے کی آنکھوں پر کوئی منظر نہیں کھلتا
یہاں لینے حساب آتا نہیں کوئی
عذاب آتا نہیں کوئی
کہ برزخ میں عدالت کا کوئی دفتر نہیں کھلتا

ندائے صُور آئے گی
تو اُس دن ہوگی میزانِ عمل قائم
اُسی دن قبر کا دروازہ وا ہوگا
ندائے صُور سے پہلے
کسی قُدسی کے دستک دینے سے یہ گھر نہیں کھلتا
یہ تہ خانہ کسی تُوری سپاہی پر نہیں کھلتا
گواہِ مُعتبر ہوں میں

☆☆☆

ڈاکٹر خیال امروہوی

سحر لازوال
(ماؤزے تنگ کی یاد میں)

بشر کی فکر کا رنگیں جمال ڈوب گیا
شعور و عزم و خرد کا جلال ڈوب گیا
شرار جہد کی تابش کا دور ختم ہوا
غنیمِ جبر کا مہر کمال ڈوب گیا
فنا کی موج نے چھینی شہاب کی تنویر
نظام عدل و ہنر کا ہلال ڈوب گیا
غریبِ شہر کی کٹیا کا نُور ختم ہوا
جفاکشوں کا مثالی سُرور ختم ہوا

نیا سماج ہے جس کے خیال سے آباد
ہے جس کے نام سے لرزاں جہان استبداد
وہ انقلاب کا پرچم ، عوام کا لشکر
وہ ارضِ چین کا سب سے عظیم دانشور
وہ عہدِ نو کی سیاست کا مجمع البحرین
وہ ارتقائے تمدن کا مطلع النورین
ستم کشانِ جہاں کا انیسِ باتدبیر
حریف خواجہ پرستی ، اُصول کی شمشیر
وہ سرپرست غریباں وہ عظمتِ دہقاں
سفیر کشور ایقاں ، حلیف پاکستاں
زمیں کو خُلد کا ہمسر بنا کے چھوڑ گیا
بشر کو عزم کا پیکر بنا کے چھوڑ گیا

وہ حریت کا پیامی وہ قاطعِ افرنگ
وہ انقلاب و جسارت کا اولین خدنگ
وہ رنگ و نسل کا دشمن ، رقیب استعمار
جہاد فکر و بصیرت کا بے بدل سالار
خرد کشائے زمانہ جہات کا منشور
نصاب علم و مساوات ، نازشِ جمہور
شعارِ صدق کلامی بلاغتِ ارقام
وہ شعر نو کی فصاحت ، درایتِ الہام
ملوکِ عصر جفایت کی شاعتِ اعمال
غرور کج کلہی کے لیے تھا ضرب زوال
شبِ فراق کبھی مختصر نہیں ہوگی
ہزار سال بھی ایسی سحر نہیں ہوگی

☆☆☆

راج کنور

ویلنٹائن ڈے

سنا تھا
آج کے دن چاہتوں کو اذن ملتا ہے
گزر جاتا ہے دھیرے سے سلگتے ہجر کا موسم
مہکتے خواب پر گرتی ہے یوں شبنم
بدن کو اک نئی تنویر ملتی ہے
سنا یہ تھا
تہہ سنگ (آج کے دن) قربتوں کا پھول کھلتا ہے
دیار یار میں ناکام ہو جاتی ہے
ہر سازش
برستی ہے عطائے مہر کی اس طرح سے بارش
کہ پانی میں نمو
کچھ کونپلیں شوریدہ جذبوں کی
سنا تھا آج کے دن
بارگاہِ حُسن سے ملتی ہے پاگل عشق کو خلعت
سنا تھا آج بہہ جاتی ہے رنگ و نور میں فطرت
سنا تھا آج کے دن
وصل کی خواہش میں بھیگی التجا کو
خوشبوؤں، تحفوں کو تحریروں کو
شرفِ باریابی مل ہی جاتا ہے
سنا یہ تھا تہہ سنگ پھول کوئی کِھل ہی جاتا ہے
مگر یہ کیا
کہ میری ہر تمنا، سارے جذبے اور تحریریں
ہجوم دوستاں میں تم نے پھر پامال کر ڈالیں
بنا کچھ بھی کہے لوٹا دیا سب کچھ
بنا کچھ بھی کیے سمجھا دیا سب کچھ
تمہیں معلوم کو ہوگا
کہ اس دن کو محبت کے حسیں جذبے سے نسبت ہے
تمہیں معلوم تو ہوگا
کہ یہ دن آج بھی اک خوب صورت نام سے
موسوم ہے جاناں

☆☆☆

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

''انگارے''، تسلسل کے ساتھ نکل بھی رہا ہے اور موصول بھی ہو رہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اپنے معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ شمارہ ۱۹ میں عالمی ادب سے خوب صورت افسانے آپ نے اپنے قارئین کو پڑھنے کے لیے پیش کیے ہیں۔ کوشش کیجیے کہ تازہ مغربی سوچ سے بھی استفادہ کیا جا سکے۔ حصۂ شاعری ہمیشہ کی طرح امیر ہے۔ خاور اعجاز کی خوب صورت غزلوں میں ایک شعر کا انتخاب:

راستے معدوم ہوتے جا رہے ہیں شوق کے — شام ہوتی جا رہی ہے عمر کی پرواز میں

فہیم شناس کاظمی کی نظموں نے مسحور کیا اور غزل کا یہ شعر:

مرا لہو کسی صحرا کی تشنگی کا بھرم — اور اک کھنچی ہوئی شمشیر میرے سر کے لیے

پرویز ساحر نوجوان شاعروں میں بہت نمایاں ہو رہے ہیں:

ہم ایک دوسرے کی ان کہی سمجھتے ہیں — بہت پرانے شناسا ہیں، آسمان اور میں

مختار جاذب، صابر ظفر، عطاالرحمٰن قاضی کی غزلوں نے لطف دیا۔

(قیوم طاہر۔ راولپنڈی)

''انگارے'' کا نیا شمارہ موصول ہوا۔ آپ نے جس لگن اور تواتر کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس نے ''انگارے'' کو اس دَور کے پرچوں میں ایک ممتاز مقام کا حامل بنا دیا ہے اور وہ بھی ایک قلیل مدت میں۔ مجھے تھوڑا سا اندازہ ہے کہ یہ کام کس قدر مشکل ہے۔ میری جانب سے پورے خلوص کے ساتھ مبارک باد قبول کیجیے۔

آپ کے ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی اچھی، دل چسپ چیز پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ محترم ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے اپنے ذخیرے میں سے پرانے خط جو نکالے ہیں وہ کسی سوغات سے کم نہیں۔ ان میں کئی دل چسپ ادبی اور سوانحی گوشے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے حاشیے بھی دل چسپ لکھے ہیں۔ بعض باتوں کی صراحت رہ گئی، مثلاً اشک صاحب نے جو خاکے ''ماہِ نو'' کو بھیجے، کیا وہ شائع ہوئے؟ مجھے اشک کی تحریروں سے بہت دل چسپی ہے۔ ان کا خاصا کام بکھرا ہوا ہے اور اسے بازیافت کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی کہانیاں اور ناول آج بھی اُردو والوں کی توجہ کے لائق ہیں۔

ڈاکٹر مظفر عباس کا مضمون بھی عمدہ ہے۔ کہانیوں کے دونوں تراجم بھی خوب ہیں۔ مگر طبع زاد افسانوں کو کیا ہوا؟ وہ ساحلوں پر گانے والے، دف بجانے والے کہاں گئے؟

(آصف فرخی۔ کراچی)

''انگارے''، مسلسل پڑھ رہا ہوں، دیر سے لیتا ہوں، اس لیے جلدی خط نہیں لکھ سکتا ہوں۔

اس بار مضامین میں ڈاکٹر معین الرحمٰن، ڈاکٹر مظفر عباس، ناصر عباس نیر کے مضامین جاندار ہیں، دونوں کہانیاں اچھی ہیں۔ غزلوں میں صابر ظفر کی دو غزلیں، معین تابش، خاور اعجاز، فہیم شناس کاظمی، محمد انور خالد، ارشد معراج کی نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ انگارے اور آپ کے لیے دعا گو ہوں۔

(خالد ریاض خالد۔ ملتان)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے خالد علیگ سے بھرپور ملاقات کرائی ہے۔ ایسی شاعری سحر ستارے کی طرح ہوتی ہے۔ جس کی روشنی میں کافور ہوتے اندھیروں کی پسپائی اور طلوع ہوتی کرنوں کی توانائی ایک تازہ تر عہد کی تخلیقی گواہی کے طور پر روشن تر ہوتے دیکھی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن میرے عہد کا سرمایہ ہیں۔ انہوں نے شہرتوں کی ہوس میں لتھڑے ہوئے دَور میں اپنے تحقیقی عمل کا طور کچھ اور ہی رکھا ہے۔ ایک خاموش مگر پُر وقار اور بااعتبار طرزِ تحقیق و جستجو نے ان کی حیات کو خوشبو سے بھر دیا ہے۔ اب ان کے لکھے حرف کی توقیر صحیِ نو کی تاثیر کی طرح دلوں کو اپنی جاگیر بناتی چلی جاتی ہے اس بار بھی ان کے ''نوادر'' نے ہمیں مالا مال کیا ہے لاریب علم ہی وہ ثروت ہے جو کبھی زائد المیعار نہیں ہوتی۔

حصہ غزل خاصا جاندار ہے ___ صابر ظفر کے نام نے اپنا مقام بنا لیا ہے مگر مقام بنانے سے زیادہ مشکل اسے برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ اب صابر ظفر کو ان مراحل سے گزرنا ہے۔ ڈاکٹر خیال امروہوی فکر و فلسفہ کے بیان میں جان ڈال دیتے ہیں غزل میں بھی ان کا رنگ جدا ہے۔ معین تابش کی پہلی غزل غضب کی ہے لیکن آج کل تو جہاد اور اجتہاد بھی اپنی معنویت میں متنازعہ ہوتے جا رہے ہیں۔ خاور اعجاز، فہیم شناس کاظمی اور پروفیسر ساحر کی غزلیں اچھی لگیں اور محمد انور خالد کی نظم نے افتخار جالب کو زندہ تر کر دیا۔

(محمد فیروز شاہ۔ میانوالی)

ماہ جون میں چھپنے والے تیرہ خطوط میں ایک بھی سطر ایسی نہیں جس میں سوچنے کا مواد ہو۔ کوئی خوب صورت فقرہ کہ آدمی زبان کا چسکا ہی لے لے۔ کسی جذبے یا احساس کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ نہیں پتہ چلتا کہ الفاظ کے پیچھے کیا شخصیت ہے۔ ذرا غالب کے خطوط دیکھیں! کیا کیا دانش و حکمت کی باتیں ہیں۔ ایسے ایسے فقرے کہ ابھی تک کوئی نقاد اتنی وزنی بات نہیں کر سکا۔ کہیں فلسفہ زیر بحث ہے تو کہیں تاریخ اور کہیں منطق اور انسانی زندگی۔ اقبال کے خطوط لیں۔ مابعد الطبیعات اور مسلم امہ کے مسائل زیر بحث آئی ہے۔ کہیں چلتے چلتے ذرا سی ذاتی بات۔ وہ بھی ایک فرد کی بات نہیں رہتی۔ مارکس اور اینگلز کے خطوط کی مثال لیں۔ اگر وہ اور کچھ نہ لکھتے تو بھی ان کا نام رہتا۔ اپنے دَور کی سیاست، فلسفے کے مسائل، ادب، سب کچھ زیر بحث آتا ہے۔ شلر Schiller کے جمالیات پر خطوط کو یہ نام دینا ہی مناسب نہیں لگتا کیونکہ وہ ادب پر مقالے ہیں۔ لیکن تیرہ خطوط میں کہیں بھی خط لکھنے والا عظیم ادیب اپنی ذات سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ یہ خط پڑھنے والے کو متاثر نہیں کرتے اور نہ ہی ان میں ادبی، تاریخی یا علمی حوالہ موجود ہے جو قابلِ توجہ ہو۔

(ابنِ حسن۔ گوجرانوالہ)

انگارے (۱۹) موصول ہوا، دل خوش ہوا۔ فرمان صاحب کا مضمون دیکھا وہ اب بہت کم لکھ رہے ہیں مگر چلو اپنے دوستوں کے لیے لکھتے تو ہیں۔ غزل الکلب والی بات بتا کر انہوں نے معلومات میں اضافہ کیا۔ چند ادیبوں کے غیر مطبوعہ خطوط دیکھے۔ یہ کس خوشی میں شائع کیے ہیں؟ سمجھنا چاہوں گا۔ ان میں کون سی ادبی یا علمی بحث تھی؟ ایسے خطوط بلا مبالغہ میرے پاس بھی درجنوں کی تعداد میں ہیں شاید دوسروں کے پاس بھی ہوں گے۔ ناصر عباس نیر نے فیض کی نظم کا تجزیہ کیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ نظم بھی ایک صفحے پر لگا دی جاتی۔ اب دیوان نکال کر کوئی سامنے رکھنے سے رہا۔

خاور اعجاز نے اکبر حمیدی پر قلم اُٹھایا۔ یہ اچھا شگون ہے۔ کوئی تو ہو جو نئے شعرا کے لیے لکھے اور غالب اور اقبال کی جان چھوڑے۔ اچھا ہو کہ وہ آج کے مستحق شعرا پر اس طرح کے مضامین کا سلسلہ شروع کریں مگر ایک خیال ضرور رکھیں وہ یک رُخے نہ نظر آئیں۔ ڈاکٹر شگفتہ حسین نے چند کتابوں پر تبصرہ لکھا ہے۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ بھی مدلل تعریف کی افادیت سے آگاہ ہیں کسی کتاب کو دو صفحے بخشے ہیں کسی کو محض ایک پیراگراف میں نمٹا دیا ہے۔ اس بار غزلیں اچھی ہیں اور ہر شاعر کی کم از کم چار غزلیں تو ہیں ہی۔ صابر ظفر صاحب کی ایک غزل ''کسی کو بھی کسی کا غم نہیں ہے ___ یہ جنت ہے یہاں ماتم نہیں ہے'' اچھی لگی مگر اس قسم کے شعر بھی ہیں۔ ''سینے سے لگا لیا جو تو نے ___ اس دل سے ہر اضطراب نکلا''

پرویز ساحر کو کیا کہہ سکتا ہوں وہ اُردو غزل کو چاہے چت کرے یا پٹ۔ بہرحال اس کا یہ شعر اچھا لگا۔ ''مت پوچھ کہ کس قدر ڈرا تھا ___ جب میں نے اسے دیا تھا اک پھول'' اس کے اور شعر بھی اچھے ہیں مگر کہیں کہیں وہ ''لوتھڑا'' بھی نظر آیا۔ فہیم شناس کاظمی کی نظم ''تم'' میں جا بہا جا Rythm بے ہنگم ہوئی ہے۔ خدا جانے یہ کتابت کا سقم ہے یا کچھ اور۔ انور خالد کی شمولیت اچھا شگون ہے۔ ارشد معراج میں تخلیقی Talent کی کمی نہیں۔ ان کے بعض بعض مصرعے مسخر کرتے ہیں مگر وہ اپنی نظم کا اختتام کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ توقع پوری نہیں ہوتی۔ خطوط میں عطاالرحمٰن قاضی نے چند شعری عیوب کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جو بالکل درست ہیں۔ البتہ کچھ جذباتی ہو کر وہ جدت پسندی کے پیچھے جو پڑے وہ درست نہیں تلفظ کی غلطی جدت نہیں سہو ہوتی ہے۔

(احمد صغیر صدیقی۔ کراچی)

''انگارے'' شمارہ جولائی ۱۹ موصول ہوا اور آپ کی خیریت کی اطلاع ملی محترم ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نہایت اختصار سے محترم خالد علیگ کے فن شعر اور شخصیت کا بھرپور جائزہ پیش کیا جب کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے منتخب خطوط بھی اہم تھے ان خطوط سے تخلیق کاروں کی ذاتی زندگی کے حالات اور مشکلات کی تصویر کشی ہوتی ہے خصوصاً اوپندر ناتھ اشک اور بانو قدسیہ کے خطوط سماجی المیے کی کربناک حقیقت کو پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مظفر عباس دَور کی کوڑی لائے ہیں اور انتظار حسین کے افسانوں میں عالم عرب کی تلاش میں ہیں انتظار حسین سرتاپا ہندی متھ کے آدمی ہیں عرب کی عکاسی اُن کے ہاں صرف الف

لیلہ کی داستان تک محدود ہے۔ ڈاکٹر مظفر عباس کی کوشش ادھوری ہے انہیں شہر افسوس، بستی تذکرہ اور آخری آدمی سے بھی مثالیں تجزیئے کے ساتھ پیش کرنی چاہئیں۔ ابن حسن کا سلسلہ مضامین بھرپور ہے مگر انہیں فلسفے کی ثقیل زبان کے بجائے ادبی اُسلوب پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ یہاں بحث اور مرکز مضمون ادبی ہے۔ لیاقت رضا جعفری نے موپساں کے افسانے کا اچھا ترجمہ کیا ہے جب کہ شوکت نعیم قادری نے اچھی کہانی انتخاب کی ہے۔ ڈاکٹر شگفتہ حسین کے کتب پر تبصروں کا سلسلہ پسند آیا اُمید ہے کہ آپ یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔ گوشۂ شعر و سخن میں محترم صابر ظفر، ڈاکٹر خیال امروہوی اور پرویز ساحر کی غزلیں پسند آئیں جب کہ شانی فریاد کی پہلی نظم اچھی لگی دوسری نظم میں عام سے گانے کا عکس صاف چھلک رہا ہے۔

(فہیم شناس کاظمی۔ نواب شاہ)

''انگارے'' ۱۹ موصول ہوا۔ ناصر عباس نیر کا تحریر کردہ فیض کی نظم ''شام'' کا تجزیہ خاصے کی چیز ہے۔ خاور اعجاز صاحب نے اکبر حمیدی کی شاعری سے بخوبی متعارف کروایا ہے۔ اس مرتبہ شاعری کا حصہ اپنا رنگ خوب دکھا رہا ہے۔ صابر ظفر، ڈاکٹر خیال امروہوی اور پرویز ساحر کے کئی شعر پسند آئے۔ میری غزل کا ایک مصرع کمپوزنگ کی غلطی سے ذرا سا بدل گیا ہے۔ ''کیا تماشا اب یہ دکھلائے عطا میزانِ عشق'' میں نے ''عشق'' کی جگہ لفظ ''شوق'' تحریر کیا تھا ''کیا تماشا اب یہ دکھلائے عطا میزانِ شوق''۔ خط میں بھی دو ایک غلطیاں دَر آئی ہیں۔ ''۔۔۔(س+ر+ھ+ا+ن+ے) بروزنِ فعولن ہے'' کی جگہ میں نے ''۔۔۔(س+رھ+ا+ن+ے) بروزنِ فعولن ہے'' تحریر کیا تھا۔ ایسے ہی ایک لفظ ''جگ''، ''جنگ'' میں تبدیل ہو گیا ہے۔ جناب احمد صغیر صدیقی کی رائے کو اہمیت دیجیے اور ''انگارے'' میں نظم و غزل کے تجزیے کا مستقل سلسلہ شروع کیجیے۔ اس مرتبہ فیض کی نظم کا تجزیہ پڑھنے کو ملا ہے۔ یہ سلسلہ آ کر مستقل جاری رہے تو کیا ہی اچھا ہو۔

(عطاالرحمٰن قاضی۔ عارف والا)

رسید و اطلاع:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)، ڈاکٹر معین الرحمٰن (لاہور)، غلام حسین ساجد (لاہور)، ناصر حسین بخاری (اسلام آباد)، پرویز ساحر (ایبٹ آباد)، ڈاکٹر خیال امروہوی (لیہ)، ''افتخار عارف (اسلام آباد)، ڈاکٹر علمدار حسین بخاری (سرگودھا)، ڈاکٹر نجیب جمال (بہاول پور)، حامد سراج (چشمہ)، دل نواز دل (لاہور)، خالد محمود سنجرانی (لاہور)، صفدر علی شاہ (سرگودھا)، ظفر اقبال نادر (عارف والا)، جمشید ساحل (لیہ)، نکہت بریلوی (کراچی)، ڈاکٹر یونس جاوید (لاہور)، ڈاکٹر طیب منیر (راولپنڈی)، ایم خالد فیاض (گجرات)، ڈاکٹر صلاح الدین درویش (اسلام آباد)

☆☆☆

ڈاکٹر شگفتہ حسین کی تحقیقی اور تنقیدی کتب

اشرف علی خان

(شخصیت، فن اور انتخابِ کلام)

(اس میں شاگردِ مصحفی اشرف علی خان کی شخصیت و فن کے ساتھ ان کے قلمی دیوان سے انتخاب بھی شامل ہے)

مطالعہ

(تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

(علمی و ادبی موضوعات پر ۹ مقالات کے اس مجموعے میں اہم نکات سے بحث کی گئی ہے)

ملنے کا پتہ

شعبہ اردو: بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان